تعلیم و تربیت

اگست 2016

جشنِ آزادی مبارک ہو

76واں سال چوتھا شمارہ
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا
بچوں کا محبوب رسالہ

تعلیم و تربیت

اگست 2016ء

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

پیارے بچو! 14 اگست وہ تاریخ ہے جس دن ہم غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہوئے۔ ہر آزاد قوم اپنی آزادی کے دن خوشی کے جشن مناتی ہے۔ اس لیے ہم بھی ہر سال 14 اگست کو یومِ آزادی مناتے ہیں۔ اس دن ملک کے مختلف حصوں میں جلسے جلوس منعقد ہوتے ہیں۔ جلسہ گاہ میں قومی پرچم کو سلامی دی جاتی ہے اور قوم کے رہنما اپنی قوم کو یاد دلاتے ہیں کہ اب تمہاری اپنی حکومت ہے اور تم آزادی کی نعمت سے مالا مال ہو۔

آزاد ہونے کا مطلب یہ ہے ہم اچھے اور نیک بن کر اپنے وطن کی دل و جان سے خدمت کریں۔ ملک میں کوئی بھوکا ننگا نہ ہو۔ رہنے کی جگہ سے کوئی محروم نہ رہے۔ بچوں کی تعلیم کا اچھا انتظام ہو۔ بیماریوں کا بہت جلد علاج ہو سکے۔ پاکستان میں اچھے اور نیک لوگوں کو پھلنے پھولنے کی آزادی ہو اور بدکار اس وقت غلام رہیں جس وقت تک وہ اپنی اصلاح نہ کر لیں۔

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ مغل شہنشاہوں کی لاپروائی نے ہمیں غلامی کے گہرے گڑھوں میں دھکیل دیا تھا۔ کاش وہ انگریزوں کو ملک میں آنے کی اجازت نہ دیتے۔ انگریزوں نے مکاری اور چالاکیوں سے اندرونِ ملک سازشوں کا جال بچھایا۔ کچھ غدار ان کے ساتھ مل گئے۔ کھوٹے سکوں کی جھنکار نے ان کے ضمیر کو سلا دیا اور ہم لوگوں نے غلاموں کا روپ دھار لیا۔ اس کے بعد ہماری روح مردہ ہو گئی اور ہم روز بروز بزدل، جاہل اور نکمے بنتے چلے گئے۔ آخر اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئی۔ وہ اپنے محبوب کی اُمت کو تباہ و برباد ہوتے ہوئے نہ دیکھ سکی۔ ہمیں اپنی غلامی کا احساس ہوا اور ہم اپنی زنجیروں کو توڑنے کی سعی کرنے لگے۔ ہم نے 1857ء میں آزادی کی جدوجہد کی۔ ہماری آزادی کا نعرہ اتنا بلند تھا کہ انگریز لرز اٹھا مگر ہم کامیاب نہ ہوئے اور ملک کو ایک بار پھر غلامی کے اندھیرے نے اپنی آغوش میں چھپا لیا، لیکن یہ آگ جو ایک بار بھڑکی تھی پھر سرد نہ ہو سکی۔ انگریزوں نے اس آگ کو خون کے چھینٹوں سے بجھانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ آخر ہمارے اقبال کا ستارہ جو گردش میں آ چکا تھا، ایک بار پھر چمک اٹھا اور ہم نے ایک سو سال بعد قائداعظم کی رہنمائی میں اس ملک کو حاصل کر لیا جس کی سرزمین کو ہمارے بزرگوں نے اپنے خون سے سینچا تھا اور اب ہم اسی ملک میں آزادی کا سانس لے رہے ہیں۔

آزادی ایک ایسی نعمت ہے جس کا اس دُنیا میں کوئی بدل نہیں۔ ہمیں اپنے وطن کی خدمت کرنے کے لیے اپنے آپ میں ہمت، استقلال اور قوتِ آزادی کو بیدار کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنے وطن کے غریب لوگوں سے محبت کرنی چاہیے۔ مجبور اور بے بس لوگوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ معاشرے سے غیر اخلاقی برائیوں کو مٹانا چاہیے اور سب سے بڑھ کر ہمیں خدمتِ خلق کرنی چاہیے۔ خدمتِ خلق سے ہمارے دل کو جو گونا گوں سکون حاصل ہوگا، وہ دُنیا کی کسی اور نیکی سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اپنے ملک کو عروج پر پہنچانے کے لیے ہمیں اپنے وطن اور لوگوں سے محبت کرنی چاہیے۔

ہماری آزادی اس وقت مکمل ہوگی جب ہم کشمیر کے لاکھوں مسلمانوں کو غلامی سے نجات دلائیں گے۔ ہم اس وقت کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں جب کشمیر آزاد ہو کر پاکستان کے پہلو بہ پہلو چلے اور اس کی حسین وادیوں پر پاکستانی پرچم لہرائے۔ آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے۔

لیجیے، اس ماہ کا رسالہ پڑھیے اور اپنی تنقید و تجاویز سے آگاہ کریں۔ آپ خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں۔

فی امان اللہ (ایڈیٹر)

اس شمارے میں

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

سرورق: یومِ آزادی

ایڈیٹر، پبلشر: ظہیر سلام

اسسٹنٹ ایڈیٹر: عابدہ اصغر

سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

خط و کتابت کا پتا

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔
UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816
E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com
tot tarbiatfs@live com

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم، لاہور۔

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361309-36361310 فیکس: 36278816

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 1000 روپے۔
مشرقِ وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے) = 2400 روپے۔
ایشیاء، افریقہ، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 2400 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرقِ بعید (ہوائی ڈاک سے) = 2800 روپے۔

قیمت فی پرچہ: 35 روپے

حمد باری تعالیٰ

تیری ذات منبع روشنی تیری شان جل جلالہ
تو قریب ہے رگِ جاں سے بھی تیری شان جل جلالہ
تو رحیم ہے تو کریم ہے تیری شان سب سے عظیم ہے
کریں انس و جاں تیری بندگی تیری شان جل جلالہ
نہ جنا ہے تو نے کسی کو بھی نہ کسی سے ہے تو جنا ہوا
تو ہے وحدہٗ لا شریک ہی تیری شان جل جلالہ
ہیں چمن چمن میں جو رونقیں تیری ذات ہی کے طفیل ہیں
ہے گلوں میں تیری شگفتگی تیری شان جل جلالہ
تو نے کن کہا تو جہاں بنے یہ مکاں بنے لامکاں بنے
دی ہے ذرے ذرے کو تازگی تیری شان جل جلالہ
تو نے ایک حور سے فیل تک سبھی کچھ بنایا جہان میں
ساری خلق تجھ کو ہے مانتی تیری شان جل جلالہ
یہ جو گردشِ شب و روز ہے یہ جو گری سردی بہار ہے
یہ قمر پکارے کلی کلی تیری شان جل جلالہ

نعت رسولِ مقبول ﷺ

شان کیا ہے آپؐ کی خیر البشر
رحمت دونوں جہاں میں سر بسر
بزم جہاں پر جلتے ہیں جبریلؑ کے
اس سے آگے رفعتوں کا ہے سفر
دونوں عالم کی چھپی ہر بات سے
آپؐ کو رکھا خدا نے باخبر
بالیقیں بدلا جہاں بھر کا نظام
آپؐ جب سے ہو گئے ہیں جلوہ گر
آپؐ کی ہر بات فرمانِ خدا
آپؐ کی ہر بات کتنی .... معتبر
ہو گیا دونوں جہاں میں سرخرو
پڑ گئی جس پر محبت کی نظر
خود بلایا ہے خدائے پاک نے
آپؐ کو عرشِ معلیٰ پر قمر

ریاض حسین قمر

محمد طیب الیاس

اچھی نیت

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔'' (بخاری، حدیث نمبر: 1)

پیارے بچو! کسی بھی نیک کام پر اس وقت تک ثواب نہیں ملتا جب تک وہ صحیح نیت سے نہ کیا جائے۔ اگر نیت صحیح ہو تو عبادت قبول ہو جاتی ہے اور اگر نیت درست نہ ہو تو عبادت بے کار ہو جاتی ہے۔ مثلاً نماز کا ثواب اسی وقت ملے گا جب وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لیے پڑھی جائے، اگر لوگوں کو دکھانے کے لیے نماز پڑھی کہ میں نمازی ہوں اور اللہ کی عبادت کی نیت نہیں کرتا تو ثواب ضائع ہو جائے گا، کیوں کہ اس نے اللہ کی عبادت کی نیت نہیں کی، بندوں کو دکھانے کی نیت کی۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے کہ: ''پھر خرابی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں۔ جو دکھاوا کرتے ہیں۔'' (الماعون، آیت: 4-6)

اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو نیت کی صورت میں ایک ایسا نسخۂ کیمیا دیا ہے جس کے ذریعے ہر مسلمان ذرا سی توجہ سے مٹی کو بھی سونا بنا سکتا ہے۔ چناں چہ جتنے جائز کام ہیں، اگر انہیں کسی اچھی نیت سے کیا جائے تو وہ عبادت بن جاتے ہیں اور ان پر ثواب ملتا ہے۔ آیئے! اس بات کو چند مثالوں سے سمجھتے ہیں۔

پہلی مثال: کھانا کھانا جائز کاموں میں سے ہے، لیکن اگر کوئی اس نیت سے کھانا کھاتا ہے کہ اس سے میرے بدن کو قوت و طاقت حاصل ہوگی اور میں اس قوت کو اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری میں صرف کروں گا تو یہ کھانا کھانا بھی اس کے لیے باعثِ اجر و ثواب ہو جاتا ہے۔ اگر یہ نیت کر لے کہ کھانا کھانے سے لذت و راحت حاصل ہوگی تو دل سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کروں گا تو اس میں بھی ثواب ملتا ہے۔

دوسری مثال: اچھا لباس پہنا جائے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے جو مجھے نعمت دی ہے اس کا اثر ظاہر ہو اور دیکھنے والوں کو فرحت حاصل ہو تو اس لباس پہننے پر بھی اجر و ثواب ملے گا لیکن اگر اچھا لباس پہننے بڑائی ظاہر کرنے لیے تو گناہ ملے گا اور ثواب سے محروم ہو جائے گا۔

تیسری مثال: مہمانوں کی مہمان نوازی کی جائے اس نیت سے کہ مہمان کا اکرام کرنا پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور ایک مومن کے حقوق میں سے ہے تو اس پر بھی ثواب مل جائے گا۔

چوتھی مثال: اپنی تحریر کو صاف اور خوب صورت بنانے کی کوشش کی جائے اس نیت سے کہ پڑھنے والوں کو آسانی اور راحت حاصل ہو تو اس اچھی نیت کی وجہ سے اس پر بھی ثواب ملے گا۔

پانچویں مثال: گھڑی اس نیت سے رکھی جائے کہ اس کے ذریعے نماز کے اوقات کا علم ہوگا اور وقت کی قدر و قیمت پہچان کر اس کو اچھے کاموں میں صرف کروں گا تو گھڑی رکھنے پر بھی ثواب مل جائے گا۔

پس معلوم ہوا کہ زندگی کا کوئی جائز کام ایسا نہیں جس کو اچھی نیت کر کے عبادت اور ثواب نہ بنایا جا سکتا ہو۔ البتہ یہ بات سمجھنے کی ہے کہ غلط کام اور گناہ اچھی نیت سے ثواب نہیں بن سکتے۔ گناہ ہر حالت میں گناہ ہی ہے، چاہے کتنی ہی اچھی نیت کر لی جائے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کے گھر اس نیت سے چوری کرے کہ جو مال حاصل ہوگا وہ صدقہ کروں گا تو اس نیت کی وجہ سے چوری کا گناہ اور جرم معاف نہیں ہوگا۔

یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ نیت کا مطلب ارادہ کرنا ہے اور ارادہ زبان سے نہیں بلکہ دل سے کیا جاتا ہے، زبان سے اگر ایک لفظ بھی نہ بولا جائے صرف دل میں ارادہ کر لیا جائے تو نیت مکمل ہو جاتی ہے۔ چوں کہ ہمارا ذہن منتشر ہوتا ہے، اس لیے بہتر یہ ہے کہ زبان سے بھی نیت کر لی جائے تا کہ دل کو سکون حاصل ہو جائے۔

پیارے بچو! آپ نے ایک کام تو یہ کرنا ہے کہ نیک کام میں نیت درست کرنی ہے، وہ یوں کہ ''میں یہ نیک کام کرتا ہوں تا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو جائے'' اور دوسرا یہ کہ اپنے جائز کاموں کو اچھی نیت سے ثواب بنانا ہے تا کہ اعمال کا رجسٹر ثواب سے بھر جائے اور آپ اللہ کے آگے سرخرو ہو سکیں۔ ☆☆☆

ایک تھا پلو

ہلکی پھلکی مزاحیہ تحریر

کاشف ضیائی

پاکستان بننے سے پہلے ساہی وال کے قریب ''پلو'' نام کا ایک بے وقوف نوجوان رہا کرتا تھا۔ اس کی عمر زیادہ نہ تھی، بس یہی کوئی پندرہ سولہ برس ہوگی۔ سر گنجا تھا، توند ذرا نکلی ہوئی تھی اور آواز بھاری تھی۔ پلو کا والد بچپن میں ہی وفات پا چکا تھا۔ ایک ماں تھی جو محنت مزدوری کر کے گھر کا خرچہ چلاتی تھی۔

اس زمانہ میں ساہی وال اور اس کے اردگرد کا علاقہ ایک انگریز افسر مسٹر جیک مارسین کے زیرنگرانی تھا۔ جیک مارسین ایک رحم دل اور ہمدرد انسان تھا۔ اس میں رعب اور افسری نام کی کوئی چیز نہ تھی بلکہ وہ ہروقت ہرایک کی مدد کے جذبے سے سرشار رہتا تھا۔

پلو کا حال یہ تھا کہ وہ سارا دن گھر میں پڑا رہتا اور روٹیاں توڑتا رہتا۔ کسی کام کو بھی وہ ڈھنگ سے نہ کرتا، بہت ہی سست اور نکما تھا۔ آخر روز روز کی بے کاری سے تنگ آ کر ایک دن اس کی ماں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے مارسین صاحب کی کوٹھی میں لے آئی۔ علاقے کے لوگوں کی عادت یہ تھی کہ وہ صبح دس بجے اپنی اپنی شکایتیں لے کر مارسین صاحب کے پاس آتے تھے۔ صبح دس بجے مارسین صاحب برآمدے میں آتے، لوگوں کے مسائل سنتے اور مناسب فیصلے کرتے۔

اس روز وہ جب برآمدے میں آئے تو وہاں پلو کی ماں کو بیٹھے دیکھا۔

''کیسے آئی ہو بڑی بی؟'' انہوں نے پوچھا۔

''وہ جی...... یہ میرا بیٹا ہے صاحب جی۔'' پلو کی ماں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''تو پھر میں کیا کروں؟'' مارسین صاحب نے دوبارہ پوچھا۔

''وہ جی...... بات یہ ہے جی۔'' پلو کی ماں نے رُک رُک کر کہا۔ ''اس کا باپ وفات پا چکا ہے، گھر میں بڑی غربت ہے، میں چاہتی ہوں آپ اسے کوئی کام دے دیں تاکہ ہمارا گزارا اچھا ہو جایا کرے۔''

''کیا نام ہے اس کا؟''

''پلو...... پلو نام ہے اس کا۔''

''پلو...... یہ تو بہت عجیب نام ہے۔'' مارسین صاحب کو حیرت ہوئی۔ ''کیا مطلب ہے پلو کا؟''

''وہ جی...... ہماری زبان میں پلو بھولے بھالے آدمی کو کہتے ہیں۔'' پلو کی ماں نے بتایا۔

''تم لوگوں نے اس کا یہ نام کیوں رکھا ہے؟''

''اس لیے کہ اس کے بھیجے میں عقل بالکل نہیں ہے۔''

یہ سن کر مارسین صاحب کو ہنسی آ گئی۔ ''بھلا کوئی انسان ایسا

بھی ہو سکتا ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''جس کے بھیجے میں عقل نہ ہو اور اگر اس میں عقل نہیں تو پھر یہ میرے پاس کام کیسے کرے گا؟''

''وہ جی..... صاحب جی عقل تو اس میں نہیں ہے، پر دیانت دار یہ بہت ہے۔'' پلو کی ماں نے بتانا شروع کیا۔ ''آپ جس کام پہ لگائیں گے لگ جائے گا، بس دو کام یہ کر دیا کرے گا ایک کام آپ خود کر لیا کرنا، اس طرح یہ آپ کے پاس کام کرتا رہے گا اور مجھ غریب عورت کا بڑھاپا اچھا گزر جائے گا۔''

''اچھا اچھا..... ٹھیک ہے۔'' مارسین صاحب تھوڑی سی بحث کے بعد مان گئے۔ ''میں اسے اپنی کوٹھی کے اندرونی کاموں کے لیے رکھ لیتا ہوں لیکن یاد رکھنا اگر اس نے سلیقے سے کام نہ کیا تو فارغ کر دوں گا۔''

''بڑی مہربانی صاحب جی۔'' پلو کی ماں انہیں دعائیں دیتی ہوئی رخصت ہوگئی لیکن جاتے جاتے ایک مرتبہ پھر کہہ گئی کہ ''صاحب! دو کام یہ کرے گا، ایک کام آپ خود کر لیا کرنا۔''

اسی طرح پلو معمولی معاوضے پر مارسین صاحب کی کوٹھی میں ملازم ہوگیا۔ اب سنیے اس کی خدمت گزاری کا حال! کون سا کام کس طرح کرنا ہے یہ تو اسے معلوم نہ تھا البتہ کھانے کا وقت خوب یاد رہتا۔ صاحب کے گھوڑے کو چارہ ڈالنا، ٹینکی میں پانی بھرنا، رات کے لیے لکڑیوں کا انتظام کرنا، اس طرح کے جتنے سخت کام تھے پلو کو سب بھول جاتے البتہ کچن میں کیا پکنا ہے یہ اسے خوب یاد رہتا۔ مارسین صاحب اس کی یہ سب حرکتیں دیکھتے رہتے لیکن کچھ نہ کہتے بلکہ اس طرح کے کام کوٹھی کے دوسرے ملازمین سے لے لیتے۔

ایک رات کا ذکر ہے، سردیوں کے دن تھے اور باہر موسم خراب تھا۔ مارسین صاحب پلنگ پر لحاف اوڑھے لیٹے ہوئے تھے۔ پاس ہی قالین پر پلو صاحب نیم دراز تھے۔

''پلو جاؤ! دیکھ کر آؤ، بارش ہو رہی ہے؟'' مارسین صاحب نے اسے حکم دیا۔

''ہو رہی ہے صاحب!'' پلو نے وہیں سے جواب دیا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا۔'' مارسین صاحب کو حیرت ہوئی۔ ''تم تو یہاں بیٹھے ہو۔'' ''باہر سے بلی آئی تھی۔'' پلو نے لیٹے لیٹے کہا۔ ''وہ گیلی تھی اس کا مطلب ہے باہر بارش ہو رہی ہے۔'' ''اچھا اٹھ کر روشنی بجھا دو۔'' تھوڑی دیر بعد انہوں نے کہا۔

''صاحب! پلو نے لیٹنے کے لیے لمبا ہوتے ہوئے کہا۔ ''منہ پر لحاف لیں، بتی خود ہی بجھ جائے گی۔'' اب کی بار بھی وہ چپ کر گئے۔

''اچھا جاؤ گیٹ بند کر آؤ۔'' کچھ دیر بعد انہوں نے تیسرا حکم دیا۔ ''دو کام میں نے کیے۔'' پلو نے رضائی لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ تیسرا کام آپ خود کر لو صاحب۔''

یہ کہا اور کروٹ لے لی۔ تھوڑی دیر میں اس کے خراٹے گونجنے لگے۔ پلو سوتے میں ایسے خراٹے لیتا تھا کہ ان کو سن کر ہنسی آتی تھی۔

یہ تھے پلو کے کام! وہ بگڑے ہوئے کاموں کو کیا بناتا، اکثر بنے ہوئے کام بھی بگاڑ کر رکھ دیتا تھا۔ مارسین صاحب اس کی ان باتوں پر کبھی ناراض ہوتے، کبھی غصہ کرتے اور کبھی سر پکڑ کر بیٹھ جاتے۔ بہرحال زندگی کسی نہ کسی طرح گزر ہی رہی تھی کہ ایک دن پلو نے ایک نیا کارنامہ دکھایا۔

ایک صبح مارسین صاحب کا حجام ان سے اپنی تنخواہ لینے آیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک زمیندار اپنی فصل کی بات کرنے آ گیا۔ پلو

نے ان دونوں کے نام چٹ پر لکھوائے تاکہ اندر جا کر صاحب کو دے سکے۔ ابھی وہ اس کارروائی سے فارغ نہ ہوا تھا کہ مقامی اسکول کا ہیڈ ماسٹر بھی آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک غریب کسان اپنی بیٹی کی شادی کے لیے امداد مانگنے آ گیا۔ پلو نے ان چاروں کو برآمدے میں کرسیوں پر بٹھایا اور ان کے نام لکھوانے لگا۔ اسی دوران مارسین صاحب کے ایک انگریز دوست بھی ملنے آ گئے۔

پلو پانچوں آدمیوں کے نام کی چٹ اندر لے گیا۔ اندر مارسین صاحب ناشتے کی میز پر بیٹھے توس پر مکھن لگا رہے تھے۔ پلو نے بتایا کہ یہ پانچ آدمی آپ سے ملنے آئے ہیں۔

مارسین صاحب کا اس وقت کسی سے ملنے کا موڈ نہ تھا۔ انہوں نے پانچوں کے بارے میں علیحدہ علیحدہ ہدایات پلو کو دیں اور ساری بات سمجھائی کہ کس کو کس طرح ڈیل کرنا ہے۔ اس کے بعد مطمئن ہو کر ناشتے میں مصروف ہو گئے۔

ادھر پلو صاحب باہر تشریف لائے اور حجام سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ ''بھئی فضلو! تنخواہ چاہیے تمہیں؟ لیکن بات یہ ہے صاحب تو سو رہے ہیں تم کل آ جانا۔'' حجام کے ساتھ ہی زمیندار بیٹھا ہوا تھا۔ پلو اس سے یہ بات کر کے زمیندار کو کہنے لگا۔ ''نون صاحب! صاحب نہا رہے ہیں آپ دو گھنٹے بعد آنا فصل کی بات پھر ہو گی۔'' اس کے بعد ہیڈ ماسٹر سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ''ماسٹر جی! اس وقت نہ آیا کریں، صاحب ناشتا کر رہے ہیں، آپ سے تو اب شام کو ملاقات ہو گی۔'' پھر کسان سے کہا۔ ''چراغ دین! تم اگلے ہفتے آنا اس ہفتے تو صاحب شکار پر گئے ہوئے ہیں۔'' سب سے آخر میں انگریز دوست بیٹھا تھا، پلو نے بڑا غمگین منہ بنا کر اس سے کہا۔ ''سر! آپ نے آنے میں دیر کر دی، مارسین صاحب کا تو پچھلے برس انتقال ہو چکا ہے۔''

یہ سب کچھ کہہ چکنے کے بعد پلو نے ان سب کو اس نظر سے دیکھنا شروع کیا کہ اب یہ اُٹھیں گے اور یہاں سے چلتے بنیں گے جب کہ ان پانچوں کا یہ حال تھا کہ پہلے وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر اچانک سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ پلو کو ان کا اس طرح ہنسنا بہت بُرا لگا، وہ حیران تھا کہ جب انہیں جواب دے دیا ہے تو جاتے کیوں نہیں؟ جب کہ وہ پانچوں ہنستے ہی چلے جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد زمیندار نے اُٹھ کر برآمدے کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔

اب کیا ہوتا؟ مارسین صاحب کو چار و ناچار باہر آنا پڑا لیکن باہر آ کر جب انہیں اصل صورت حال کا علم ہوا تو وہ بھی ہنسنے والوں میں شریک ہو گئے۔ یہ تھے پلو کے کام اور یہ تھے پلو کے کارنامے! لیکن اس کے باوجود پلو کی قسمت بہت اچھی تھی۔ وہ اس طرح کہ جب 1947ء میں پاکستان بنا اور مارسین صاحب یہاں سے واپس انگلینڈ گئے تو جاتے جاتے اپنی کوٹھی پلو کے نام لکوا گئے۔ پلو کے تو وارے نیارے ہو گئے۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ اس کوٹھی میں رہنے لگا، اس کے بعد اس کی اولاد وہاں رہی۔ ساہیوال کے مضافات میں یہ جگہ آج بھی ''انگریز کی کوٹھی'' کے نام سے مشہور ہے اور اس جگہ ایک بس اسٹاپ بھی بنا ہوا ہے۔

☆☆☆

(بقیہ: محمد علی جوہر)

مقدمہ کراچی کے خالق دینا ہال میں چلا اور دو سال قید بامشقت کی سزا ملی۔ دوران قید یہ شعر بے حد مشہور ہوا۔

بولی اماں محمد علی کی !!
جاں بیٹا خلافت پہ دے دو

1930ء کے آخر میں لندن میں گول میز کانفرنس بلائی گئی۔ مقصد ہندوستان کے مسئلے کو مل بیٹھ کر حل کرنا تھا۔ اس کانفرنس میں محمد علی جوہر کو بھی شرکت دعوت ملی، مگر اس وقت ان کی طبیعت بے حد ناساز تھی، حالت ایسی نہ تھی کہ کوئی مشقت برداشت کر سکتے، مگر پھر بھی یہ مسلمانوں کی آزادی سے متعلق کام تھا، وہ اس کام میں پیچھے کیسے رہ سکتے تھے۔ انہوں نے ہندوستان سے لندن تک کا بحری سفر جہاز میں لیٹ کر کیا۔ لندن پہنچے، بیگم محمد علی جوہر بھی ہمراہ تھیں۔ کانفرنس میں شرکت کے لیے پہنچے تو تقریر کے وقت جسمانی نقاہت تو بہت تھی مگر آواز اور لہجے میں وہی گھن گرج تھی جو ان کی شخصیت کا حصہ تھی۔ جسم کئی بیماریوں میں گھرا ہوا تھا مگر شیر کی آواز اب بھی گرج رہی تھی۔

''میں آج یہاں جس مقصد کے لیے آیا ہوں، وہ ہے آزادی۔ تمہیں میرے وطن کو آزادی دینا ہو گی۔ میں ایک غلام ملک میں واپس نہیں جاؤں گا۔ اگر آزادی نہیں ملی تو تمہیں میری قبر کے لیے جگہ دینی ہو گی۔''

4 جنوری 1931ء صبح تحریک آزادی کا یہ رہ نما اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ مفتی اعظم فلسطین کی خواہش پر انہیں مسجد عمر، فلسطین کے احاطے میں دفن کیا گیا۔

مشہور انگریزی ناول نگار ایچ جی ویلز (H.G.Wells) نے انہیں ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔

''محمد علی کا دل نپولین کا دل، اس کا قلم میکالے کا قلم اور اس کی زبان برک کی زبان تھی۔''

☆☆☆

گلاب پری

علی اکمل تصور

وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ یوں جیسے کوئی چور چوری کرنے سے پہلے گھبرا جاتا ہے۔ اس کے اعصاب پر یہ خوف سوار ہوتا ہے کہ کہیں میں چوری کرتے پکڑا نہ جاؤں، کہیں کوئی مجھے دیکھ نہ لے۔ اسی خوف کے پیشِ نظر وہ گھبرایا ہوا تو تھا ہی، ساتھ ہی وہ اپنے اطراف میں دیکھ رہا تھا۔ اس کے امی ابو ایک درخت کی چھاؤں میں چٹائی بچھائے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اس کے چھوٹے بہن بھائی تتلیوں کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ وہ اپنے کھیل میں پوری طرح مگن تھے اور وہ ایسے ہی چہل قدمی کرتے ذرا دُور آ گیا تھا اور پھر ایک منظر دیکھ کر وہ ٹھٹھک کر رُک گیا۔ گلاب کا ایک بڑا سا کھلا ہوا پھول اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ حیرت والی بات یہ تھی کہ پورے باغ میں بس یہ ایک ہی گلاب کا پودا تھا اور اس سے بھی بڑی حیرت والی بات یہ تھی کہ اس اکلوتے پودے پر بس ایک ہی گلاب کھلا ہوا تھا۔ کوئی دوسری کلی نہیں تھی۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا گلاب کے اس پودے کے پاس آ گیا۔ گلاب کے پھول کی مہک اسے مسرور کر رہی تھی۔ بہت ہی خوشبو دار اور خوب صورت پھول تھا۔ اتنے میں اس کے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی۔ یہ اس کی امی کی آواز تھی۔

”رضوان...... رضوان...... کہاں ہو تم؟“

”آیا امی......“ اب اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ اسے فوراً امی کے پاس پہنچنا تھا اور گلاب کا پھول...... پھر اس نے ایک ایسی حرکت کی جو اکثر بچے کرتے ہیں۔ اس نے ایک جھٹکے سے گلاب کا پھول شاخ سے توڑ لیا تھا اور پھر وہ پھول ہاتھ میں پکڑے واپسی کے لیے دوڑ پڑا۔ چند لمحوں میں ہی وہ امی ابو کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اتنا خوب صورت پھول دیکھ کر امی اور ابو کو حیرت ہوئی تھی۔

”گلاب کا یہ پھول کہاں سے لیا۔“ ابو نے پوچھا تھا۔

”وہ اس طرف ایک پودا تھا گلاب کا...... وہاں سے توڑا ہے۔“

”بہت غلط بات...... پھولوں کو توڑنا نہیں چاہیے...... ان کی وجہ سے ماحول خوب صورت نظر آتا ہے۔ اب یہ ایک آدھ دن میں مرجھا جائے گا...... تم نے بہت غلط کام کیا ہے۔“ ابو ناراضگی سے بولے تھے۔

”ابو جی معاف کر دیجیے۔“ رضوان نے فوراً ہی اپنی غلطی مان لی اور ابو خوش ہو گئے۔

”اگلی بار احتیاط کرنا۔“ ابو نے ہدایت کی تھی۔

”جی ابو۔“ اب گھر واپسی کا سفر شروع ہوا۔ آج چھٹی کا دن تھا۔ تفریح کی غرض سے گھر کے تمام افراد اس باغ میں آئے تھے۔

باغ کا مالک ابو کا دوست تھا۔ اس لیے فکر والی کوئی بات نہیں تھی۔ اب وہ سب اس تفریح کی یادیں اپنے ساتھ لے کر جا رہے تھے جب کہ رضوان کے پاس یاد سے کچھ زیادہ تھا اور وہ تھا گلاب کا تروتازہ پھول..... مگر ابو نے بتایا تھا کہ یہ مرجھا جائے گا اس وجہ سے رضوان کچھ بے چین بھی تھا۔ واپسی کے سفر میں ایک بات جو رضوان نے محسوس کی تھی وہ یہ تھی کہ اب گلاب کا یہ پھول مہک نہیں دے رہا تھا۔ خوب صورت تو تھا مگر خوشبو سے محروم......

پھر وہ سب گھر پہنچ گئے۔ ابو نے رضوان کو ایک ترکیب بتائی تھی کہ ایک تنگ منہ والی بوتل میں پانی بھر کر اس پھول کو بوتل میں رکھو۔ اس عمل سے پھول تروتازہ رہے گا۔ اب وہ پھول رضوان کے بستر کے پاس ایک چھوٹی سی گول میز پر ایک بوتل میں رکھا ہوا تھا۔ رضوان نے ایک آدھ بار اس پھول کی طرف دیکھا۔ نہ جانے کیوں اسے اس بات کا احساس ہوا کہ پھول اداس ہے۔ پھر اس نے اس بات کو اپنا وہم سمجھ کر سر جھٹک دیا۔ رات ہوئی رضوان سونے کے لیے لیٹ گیا۔ وہ دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔ لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔ معلوم نہیں وہ رات کا کون سا پہر تھا جب سوتے جاگتے کی کیفیت میں رضوان کے کانوں سے کسی کے سسکیاں بھرنے کی آواز ٹکرائی۔ پہلے اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو مگر یہ خواب نہیں تھا۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ آواز اب بند ہو چکی تھی۔ کمرے میں انرجی سیور جل رہا تھا۔ اسے عادت تھی روشنی میں سونے کی...... سسکیوں کی آواز سن کر وہ بے چین ہو چکا تھا۔ اس نے اردگرد نظر دوڑائی اور پھر ایک مقام پر اس کی نظر ٹھہر کر رہ گئی۔

"یہ کیا ماجرا ہے؟" وہ سوچنے لگا۔ گول میز کے اوپر پانی کے قطرے بکھرے ہوئے تھے۔ پھول تروتازہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے بوتل اُٹھا کر دیکھی، وہ سلامت تھی۔ بوتل میں کسی بھی جگہ ایک سوئی برابر بھی سوراخ موجود نہیں تھا۔ پھر پانی کے قطرے کہاں سے آئے۔ وہ سوچنے لگا، مگر اس سوال کا کوئی جواب موجود نہیں تھا۔ باقی کی رات رضوان نے آنکھوں میں کاٹ کر گزار دی۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی اور پھر سسکیاں بھرنے کی آواز بھی نہیں آئی۔ اگلے دن وہ وقت پر اسکول پہنچا۔ رات بھر جاگنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، پھر کلاس روم میں اسے ایک بات یاد آئی اور وہ لرز کر رہ گیا۔ آج اس کا انگلش کا ٹیسٹ تھا اور وہ بھول گیا تھا۔ اس نے تیاری بھی نہیں کی تھی۔ چھٹی کا سارا دن آوارہ گردی میں گزار دیا تھا اور امی، ابو کو بتایا بھی نہیں تھا، پھر نتیجہ حسب حال آیا۔ رضوان ٹیسٹ میں فیل ہو گیا تھا۔ نتیجے میں اسے اپنے دونوں ہاتھوں پر ایک ایک ڈنڈے کا تحفہ ملا تھا۔ اسکول سے چھٹی کے بعد جب وہ گھر پہنچا تو بہت اداس تھا۔ سزا ملنے کی وجہ سے اس کا رونے کو دل چاہ رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں میں آنسو چھپائے کمرے میں چلا آیا۔ ہاتھوں میں ابھی تک درد ہو رہا تھا، پھر وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"کیا ہوا رضوان۔" اچانک ایک سیٹی کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس نے چونک کر آواز کی سمت میں دیکھا مگر وہاں تو کوئی نہیں تھا۔ بس گلاب کا تروتازہ پھول نظر آ رہا تھا۔ حیرت والی بات تھی۔ وہ ابھی تک تروتازہ تھا۔ رضوان نے سر جھٹکا لیا۔

"رضوان کیوں رو رہے ہو؟" اب کی بار تو رضوان اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بہت ڈر گیا تھا۔ خوف اس کی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔

"ڈرو نہیں...... یہ میں ہوں۔" آواز گلاب کے پھول میں سے آ رہی تھی۔ خوف کی جگہ اب حیرت نے لے لی تھی۔

"تت......تم کون ہو؟" وہ ہکلا کر بولا۔

"یہ میں ہوں......گلاب پری۔" پھول میں سے آواز آئی تھی۔

"یہ...... یہ کیسے ممکن ہے۔" رضوان جو دیکھ رہا تھا اس پر یقین کرنا مشکل تھا۔ بھلا کبھی گلاب کے پھولوں نے بھی باتیں کی ہیں۔

"ہاں میں سچ کہہ رہا رہی ہوں۔ میں گلاب پری ہوں...... تم نے انجانے میں میرے ساتھ بہت ظلم کیا ہے۔"

"ظلم...... کیسا ظلم......؟"

"میں پرستان سے آئی تھی۔ تمہاری دُنیا کی سیر کرنے...... میری امی نے مجھے روکا بھی تھا مگر میں بغیر بتائے چلی آئی، پھر میرا گزر باغ میں سے ہوا۔ دل چاہا کہ تھوڑی دیر یہاں قیام کر لوں۔ میں اپنی شکل بدل کر گلاب کا پودا بن گئی۔ میں دھوپ کی حرارت محسوس کر رہی تھی۔ میں ٹھنڈی ہواؤں کے مزے لے رہی تھی کہ تم چلے آئے۔ میں نے تمہارے ارادے کو بھانپ لیا تھا۔ اپنی اصل شکل میں آنے کے لیے مجھے تھوڑا وقت چاہیے تھا مگر تم نے مجھے وقت نہیں دیا۔ میں نے شور مچایا مگر تم نے میری آواز نہیں سنی اور

ایک جھٹکے میں میرا سر میرے وجود سے الگ کر دیا۔ بہت ظلم کیا اور پھر مجھے اس کمرے میں قیدی بنا کر رکھ دیا۔ ساری رات میں اپنے ابو اور امی کو یاد کر کے روتی رہی ہوں اور اب تمہیں روتا دیکھ کر محسوس ہوا کہ میری طرح تم بھی شاید تکلیف میں ہو...... اس لیے تمہارے ساتھ بات کی...... کیا ہوا تمہیں...... کیا تمہارے ساتھ بھی کسی نے ظلم کیا ہے؟''

''نہیں...... نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں...... ہم اسکول میں پڑھنے والے بچے ہیں۔ جب ہم اپنا سبق یاد نہیں کرتے تو ہماری پٹائی ہوتی ہے۔ میری مشکل اتنی بڑی نہیں ہے۔ میں دل لگا کر پڑھوں گا تو پٹائی بھی نہیں ہوگی اور اپنے ٹیسٹ میں بھی کام یاب ہو جاؤں گا، مگر تمہاری مشکل بہت بڑی ہے۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ کیا اب میں تمہاری کچھ مدد کر سکتا ہوں؟''

''ہاں! اگر تم چاہو تو۔''

''کیا کرنا ہوگا مجھے۔''

''تمہیں شاید تکلیف تو ہوگی، مگر تم مجھے جس باغ میں سے توڑ کر لائے ہو، اسی باغ میں مجھے اپنے ساتھ لے کر جانا ہوگا۔ جب تم اس پودے کے ساتھ میرا سر جوڑو گے تو میں ایک خاص عمل کروں گی اور پھر سے اس پودے کا حصہ بن جاؤں گی۔ اس کے بعد میرے لیے ممکن ہو گا کہ میں اپنی اصل صورت میں واپس آ جاؤں اور پھر اپنے گھر اپنے امی ابو کے پاس واپس لوٹ جاؤں...... کیا تم میرے لیے یہ تکلیف اُٹھا سکو گے؟'' گلاب پری کا لہجہ سوالیہ تھا۔

''ہاں...... کیوں نہیں...... تمہاری زندگی کا سوال ہے...... غلطی میں نے کی ہے...... مداوا بھی مجھے ہی کرنا چاہیے...... ہم ابھی روانہ ہوں گے۔'' اب رضوان نے کمرے سے نکل کر ٹوہ لی تھی۔ ابو تو شام کو گھر لوٹتے تھے۔ ہاں امی کھانا تیار کرنے میں مصروف تھیں۔

''امی میں اپنے دوست کے گھر جا رہا ہوں۔ جلد لوٹ آؤں گا۔'' ''بیٹا...... ابھی ابھی اسکول سے آئے ہو۔ کھانا کھا لو...... پھر چلے جانا۔''

''امی جان بہت ضروری ہے...... میں یہ گیا اور یہ آیا...... کھانا واپس آ کر کھاؤں گا۔'' امی رضامند ہو گئی تھی۔ اب رضوان نے اپنی ریسی سائیکل نکال لی تھی۔ پھول اس کے پاس تھا۔ اب باغ کی طرف سفر شروع ہوا۔ رضوان کے سر پر جنون سوار تھا۔ اس لیے اس کی رفتار بہت تیز تھی۔ دوپہر ہونے کی وجہ سے سڑک پر ٹریفک کا ہجوم بھی نہیں تھا۔ وہ شہری حدود سے نکلا اور گاؤں کی حدود میں داخل ہو گیا۔ یہاں بھی ویرانہ تھا۔ پھر وہ اپنے ابو کے دوست کے باغ میں پہنچ گیا۔ اس نے ایک جگہ پر سائیکل کھڑی کی اور پیدل ہی آگے بڑھا۔ پھر وہ خوف کی شدت سے کانپ کر رہ گیا۔ اس کے کانوں سے کتوں کے بھونکنے کی آواز ٹکرائی تھی۔ باغ کی رکھوالی پر مامور کتے آ پہنچے تھے قریب تھا کہ رضوان دوڑ لگا دیتا کہ گلاب پری بول اُٹھی۔

''رُک جاؤ رضوان...... کتوں کی فطرت ہوتی ہے کہ یہ بھاگنے والوں کا تعاقب کرتے ہیں اور کاٹتے ہیں۔ تم اپنی جگہ پر کھڑے رہو۔ یہ کتے تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔'' اب رضوان کے قدم اپنی جگہ پر جم گئے تھے۔ یہ تعداد میں تین کتے تھے، وہ بھاگتے ہوئے آئے تھے اور انہوں نے رضوان کو گھیر لیا تھا۔ اب وہ مسلسل بھونک رہے تھے اور رضوان اپنے قدموں پر جما ہوا تھا۔ چند لمحے گزرے تو گلاب پری نے سرگوشی کی۔

''اب جھک کر پتھر اُٹھانے کی اداکاری کرو۔'' جیسے ہی رضوان جھکا، کتوں نے اُلٹے قدموں دوڑ لگا دی۔ یہ عام سے دیہاتی کتے تھے۔ انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ آنے والا چور نہیں ہے۔

پھر رضوان اس سمت میں بڑھا جہاں گلاب کا وہ پودا موجود تھا۔ پھر وہ پودے کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس نے احتیاط سے گلاب کا پھول اپنے ہاتھ میں پکڑا اور پودے کے سامنے دو زانوں بیٹھ گیا اور پھر جیسے ہی اس نے گلاب کا پھول ڈالی کے ساتھ لگایا۔ اس کے اطراف میں جیسے ستاروں کی بارش ہونے لگی۔ اس نے ایسا منظر اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ مسرت اس کی آنکھوں میں رقص کر رہی تھی۔ پھر رضوان نے محسوس کیا۔ خوشبو سے فضا مہک اُٹھی تھی۔ گلاب کا پھول پودے کے ساتھ پھر سے جڑ گیا تھا اور اب وہ ہوا کے دوش پر جھوم رہا۔ پھر اچانک ایک بار پھر سے ستاروں کی بارش ہوئی اور رضوان حیران رہ گیا۔

گلاب کا پودا اب غائب ہو چکا تھا اور فضا میں ایک پیاری سی ننھی منی سی پری معلق تھی۔

''شکریہ رضوان...... شکریہ!'' وہ مسکرا کر بولی۔ رضوان کی حیرت کا عالم دیکھنے والا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار پری دیکھی تھی۔

''اب میں اپنے گھر چلتی ہوں، تم بھی اپنے گھر جاؤ...... تمہاری امی انتظار کر رہی ہوگی۔'' رضوان نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اور سنو...... تم نہیں جانتے...... پاک خالق کی مخلوق کس حال میں موجود ہوتی ہے۔ اس لیے کسی کو بھی نقصان پہنچانے کی کوشش مت کیا کرو۔''

''ہاں...... اب میں یہ بات اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔'' رضوان نے سر ہلا کر جواب دیا پھر وہ جلدی سے بولا۔

''اچھی گلاب پری...... کیا یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔'' گلاب پری کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

''نہیں...... ابھی تو ہم دوست بنے ہیں...... میں اکثر تم سے ملنے آتی رہوں گی۔'' اتنا کہہ کر گلاب پری نے بل کھا کر پرواز کی اور اپنے پیچھے ستاروں کا جھرمٹ چھوڑ گئی۔ رضوان اپنا ہاتھ ہلا ہلا کر اسے الوداع کہہ رہا تھا۔ یہ دوستی ان دونوں کے لیے بہت مبارک ثابت ہوئی تھی۔ ایک دوسرے کی مدد سے وہ دونوں کام یاب ہوئے تھے۔

کھوج لگانے میں حصہ لینے والے بچوں کے نام

مرزا محمد احمد، فیصل آباد۔ سائرہ حبیب، تاندلیانوالہ۔ بشریٰ حسینی، خنسہ حسینی، کلورکوٹ۔ نور الایمان، فیصل آباد۔ محمد اکرم شریف، میانوالی۔ اُمنہ عمران، لاہور۔ مریم مصطفیٰ، قریشہ فاطمہ فاروقی، رحیم یار خان۔ مریم شفیق، لاہور۔ عدن سجاد، جھنگ۔ عشرہ امین، لاہور۔ سید محمد احمد، لاہور۔ نمرہ مہک، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ محمد بن احسن، لاہور۔ سراج جمیل خواجہ، ڈیرہ غازی خان۔ ثمین مقصود، لاہور۔ اسد عبداللہ، ملتان۔ آمنہ عاصم، گوجرانوالہ۔ علی طاہر، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ حمزہ نعمان، فیصل آباد۔ مشعال آصف، لاہور۔ محمد حارث، شیخوپورہ۔ رخبا اطہر ضیا، لاہور۔ زوہا فضل، لاہور۔ شاہ زیب احمد، راول پنڈی۔ محمد شمعون بٹ، لاہور۔ ملک محمد احسن، راول پنڈی۔ سجاد حیدر، کراچی۔ ثوبیہ اسلم، لاہور۔ سعود الحسن، خانیوال۔ رانا عبداللہ، ملتان۔ نور الامین، اسلام آباد۔ بشریٰ بتول، رسال پور۔ مریم نواز، فیصل آباد۔ ندیم بیگ، نوشہرہ۔ محمد سلیمان بٹ، ساہی وال۔ محمد عثمان حیدر، پشاور۔ اعیان جاوید، حیدر آباد۔ عروسہ خالد، اٹک۔ محمد زبیر ارشد، لاہور۔ عائشہ نذیر، کراچی۔ امتیاز عالم، داہ کینٹ۔ لائبہ بشیر، قلعہ دیدار سنگھ۔ عبدالغفور حیدر، کراچی۔ نورین اشفاق، رحیم یار خان۔ جلال عابد بٹ، دینہ۔ ظل ہما، حیدر آباد۔ نوشین مسعود، ملتان۔ محمد نیین قمر، خانیوال۔ افتخار بھٹی، جہلم۔ راجہ محمد اسلم، راول پنڈی۔ عامر سہیل، لاہور۔ عمران فاروق، اوکاڑہ۔ عمیرہ بشیر، قصور۔ زاہد حسین، داہ کینٹ۔ ام کلثوم، خانیوال۔ احسن فاروق، راول پنڈی۔ عفت بتول، لاہور کینٹ۔ محمد ثاقب، ملتان۔ زینب اظہر، میرپور آزاد کشمیر۔ سلیمان اسلم، داہ کینٹ۔ ملائکہ ندیم، سرگودھا۔ مدثر نذیر، گوجرانوالہ۔ آمنہ عاطف، گوجرانوالہ۔ شاہ زیب اسد، کراچی۔ خرم نذیر، فیصل آباد۔ طیب الیاس، بہاول پور۔ زین العابدین، خانیوال۔ خدیجہ منیب، بورے والہ۔ محمد فہد، گوجر خان۔ اسلم ریاض، اسلام آباد۔ ہمایوں رشید، بھکر۔ خرم اقبال، ایبٹ آباد۔ آمنہ بی بی، ڈیرہ اسماعیل خان۔ طاہر ریاض، شیخوپورہ۔ سلمان شاہد، گوجرانوالہ۔ مرزا احسن، فیصل آباد۔

راشد علی نواب شاہی

پیارے اللہ کے پیارے نام

اَلْفَتَّاحُ جَلَّ جَلَالُہٗ

(سب کے لیے رحمت کے دروازے کھولنے والا)

اَلْفَتَّاحُ جَلَّ جَلَالُہٗ وہ ذات ہے جو اپنے بندوں کے لیے اپنی رحمت اور رزق کے دروازوں کو کشادہ کرتا ہے اور ان کے مشکل مسائل کو حل فرماتا ہے۔ اپنے بندوں کے گناہوں کی وجہ سے وہ اپنی نعمت کے دروازوں کو بند نہیں کرتا۔

عزیز ساتھیو! قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:
''جس رحمت کو اللہ لوگوں کے لیے کھول دے تو کوئی نہیں ہے جو اسے روک سکے اور جسے وہ روک لے تو کوئی نہیں ہے جو اس کے بعد اسے چھڑا سکے اور وہی ہے جو اقتدار کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔''

مشکل ہوئی آسان

برسوں پرانی بات ہے۔ تین آدمی سفر پر جا رہے تھے کہ اچانک بارش شروع ہوگئی۔ فوراً ان تینوں نے ایک غار میں پناہ لے لی۔ طوفانی بارش کی وجہ سے غار کے منہ پر پہاڑ کی ایک چٹان گر پڑی اور وہ غار جس میں وہ بارش سے حفاظت کے لیے بیٹھے تھے اس کا دہانہ چٹان گرنے کی وجہ سے بند ہوگیا۔

اب تو تینوں بڑے پریشان ہوئے کہ یہ چٹان تو کسی بھی طرح اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتی۔ اس غار سے کیسے باہر نکلا جائے......؟ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ کیا کیا جائے۔ مشورہ کرنے پر اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ زندگی میں کوئی ایسا کام جو صرف ہم نے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے کیا ہے اس نیک عمل کا واسطہ دے کر اس وسیلے کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگتے ہیں۔ شاید اس برکت سے اللہ تعالیٰ ہمارے لیے راستہ کھول دے۔

ان میں ایک شخص نے کہا: ''اے اللہ! میرے والدین ضعیف تھے۔ میری بیوی اور چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ میں ان کے لیے روزانہ بکریاں چراتا تھا۔ جب شام ہوتی تو ان بکریوں کا دودھ دوہتا اور سب سے پہلے اپنے بوڑھے والدین کو پلاتا اور پھر اپنی بیوی بچوں کو پلاتا۔

ایک روز میں لکڑیاں تلاش کرنے کے لیے جنگل میں دُور نکل

گیا اور دیر سے واپس آیا تو میرے والدین سو چکے تھے۔ میں نے جلدی سے دودھ دوہا، پھر دودھ کو ایک برتن میں ڈالا اور اپنے والدین کے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اپنے والدین کو نیند سے جگاؤں اور مجھے یہ بھی گوارا نہ تھا کہ والدین سے پہلے اپنے بچوں کو دودھ پلاؤں، حالاں کہ بچے بھوک سے میرے قدموں میں بلک بلک کر رو رہے تھے۔ وہ دودھ پینے کی ضد کر رہے تھے یہاں تک کہ صبح کا وقت ہو گیا لیکن میں نے اپنے والدین سے پہلے اپنے بیوی بچوں کو دودھ نہیں پلایا۔

اے اللہ! اگر میرا یہ عمل آپ کو راضی کرنے کے لیے تھا تو اس عمل کی برکت سے ہمارے واسطے اس غار کا منہ کھول دے اور ہمیں باہر جانے کا راستہ دے دے۔''

جیسے ہی اس نے دُعا مکمل کی تو غار سے تھوڑی سی چٹان ہٹ گئی انہیں آسمان نظر آنے لگا، مگر ابھی راستہ اتنا نہیں کھلا تھا کہ وہ باہر نکل سکیں۔

پھر دوسرے ساتھی نے دُعا مانگی: ''اے اللہ! میں نے ایک مزدور کو ملازمت کے لیے رکھا۔ مزدوری میں اسے چاول دینے تھے۔ جب اس نے مزدوری ختم کر دی تو اس نے کہا کہ میرا حق مجھے دے دو۔ میں نے اس کی مزدوری میں اسے چاول دیے تو وہ ناراض ہو کر انہیں لیے بغیر چلا گیا۔ وہ اپنی مزدوری نہ لے سکا۔''

میں نے ان چاولوں سے کھیتی باڑی کی اور چاولوں سے اور چاول اُگائے۔ اس میں بہت برکت ہوئی پھر میں نے انہی چاولوں سے گائیں اور مویشی جمع کر لیے۔

پھر کافی عرصہ بعد وہ ایک مرتبہ میرے پاس آیا اور اپنی مزدوری مانگنے لگا۔ میں نے کہا: ''جاؤ وہ ساری گائیں اور مویشی تم لے لو۔'' وہ کہنے لگا: ''اللہ سے ڈرو اور مجھ سے مذاق مت کرو۔''

میں نے کہا: ''میں تم سے مذاق نہیں کر رہا۔'' اور اسے ساری صورت حال بتائی۔

''جاؤ ساری گائیں اور جانور لے لو۔'' اس نے وہ سب لے لیں اور چلا گیا۔

''اے اللہ! اگر میں نے یہ کام آپ کو راضی کرنے کے لیے کیا ہے تو ہمارے لیے جو رکاوٹ باقی رہ گئی ہے اس کو دُور فرما۔'' چناں چہ چٹان تھوڑی سی اور سرک گئی، مگر ابھی اتنا راستہ نہ ہوا کہ وہ نکل سکتے۔

پھر تیسرے شخص نے بھی اپنے نیک عمل کے ذریعے سے دُعا مانگی اور جیسے ہی اس کی دُعا مکمل ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے غار کے منہ سے اس کی چٹان کو ہٹا دیا اور پورا راستہ کھل گیا۔

اس اَلْفَتَّاحُ جَلَّ جَلَالُهُ نے اپنی رحمت سے ان کے لیے بند دروازہ کھول دیا اور پھر وہ تینوں خوشی خوشی اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

مسجد میں داخل ہوتے وقت کیا مانگیں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو اسے چاہیے پہلے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے پھر یہ دُعا مانگے:

اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ.

ترجمہ: اے اللہ! میرے لیے آپ اپنی رحمت کے دروازے کھول دیجیے۔

یاد رکھنے کی باتیں

۱۔ اس نام مبارک سے ہمیں یہ سبق ملا کہ ہر مشکل اور پریشانی کو راحت میں تبدیل کرنے والے صرف اکیلے اللہ تعالیٰ ہیں۔ جس طرح اس نے ان تینوں آدمیوں کی مدد کی اور ان کے لیے بند دروازے کو کھولا تو ہمیں بھی یقین ہوا کہ ہر مشکل، پریشانی، مصیبت کو وہی حل فرمانے والے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں جو ہماری مشکل حل کر سکے۔

ہر قسم کی راحت، رحمت اور آسانی وہی اَلْفَتَّاحُ جَلَّ جَلَالُهُ عطا فرماتے ہیں۔

۲۔ جب بھی مسجد میں داخل ہوں تو توجہ اور ترجمہ کے دھیان کے ساتھ دُعا مانگیں تا کہ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے دروازے کھل جائیں۔ دُعا یہ ہے:

اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ.

☆☆☆

ننھا سپاہی

احمد عدنان طارق

جنوبی یورپ میں اٹلی کے ساحلوں کے نزدیک ایک جزیرہ ہے جس کا نام کورسیکا ہے۔ یہ جزیرہ بحر اوقیانوس میں واقع ہے۔ وہاں اُونچے پہاڑ ہیں جن کی وادیوں میں کئی گاؤں ہیں۔ کوئی دو سو سال پہلے وہاں ایک خاندان انہی دیہات کے ایک گاؤں میں رہتا تھا جسے بونا پارٹ کے خاندانی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ بہت ہی غریب خاندان تھا لیکن پھر بھی اس خاندان کے بچے بہت خوشی سے زندگی گزار رہے تھے۔ سبھی بچے لڑکے تھے اور یہ سبھی بھائی ایک بڑے کمرے میں رہتے تھے۔ اسی کمرے کو وہ کھیل کے میدان کی طرح بھی استعمال کرتے تھے۔ برسات کے دنوں میں ان کے کمرے کے قریب سے گزرنے والے ہمیشہ فوج میں بجنے والے ڈرم کی دھنیں سن سکتے تھے اور فوجی احکامات کی آوازیں بھی جیسے اٹن شن...... پیچھے مڑ وغیرہ۔

یہ سبھی بھائی فوجی بن کر کھیلتے رہتے تھے۔ اس کھیل کو کھیلتے ہوئے جو بچہ سب سے زیادہ لطف اندوز ہوتا، وہ سب سے چھوٹا تھا اور اس کا نام تھا نپولین۔ وہ کبھی صاف ستھرا نہیں رہتا تھا اور اپنے کپڑوں کا دھیان بھی نہیں کرتا تھا۔ اس کے گھنگھریالے بال ہمیشہ اس کے ماتھے پر گرے رہتے تھے۔ اس کا مزاج ہمیشہ تبدیل ہوتا رہتا تھا۔ کبھی وہ بہت خاموش ہوتا اور کبھی بہت غصے میں۔ اسے ہمیشہ ہر کھیل میں سردار بنا دیا جاتا کیوں کہ وہ جس کام کو کرنے کا تہیہ کر لیتا، اسے سرانجام دے کر چین کی سانس لیتا۔ اگر کسی کام میں اسے ناکامی ہوتی تو وہ اسے دل پر لے لیتا اور رو رو کر بُرا حال کر لیتا۔ وہ ہر کھیل میں بس جیتنا ہی چاہتا تھا۔ ہارنے پر یا تو وہ بہت شرمندہ ہوتا یا پھر بہت غصے میں آ جاتا۔

جب نپولین چھ سال کا تھا تو وہ اپنے بھائی جوزف کے ہمراہ اسکول گیا۔ ایک دن ان کے اُستاد نے جماعت کی دو ٹولیاں بنا دیں۔ ایک ٹولی رومیوں کی تھی اور دوسری کارتھیگیوں کی۔ وہ چاہتا تھا کہ دونوں لشکروں کی جنگ ہو جس میں فوجیوں کی طرح بچے ذہن کو استعمال کر کے ایک دوسرے کو شکست دینے کی کوشش کریں۔ ابھی یہ مشق شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ اسے سخت غصے میں بولنے کی آوازیں آئیں۔ اُستاد نے دیکھا تو یہ شور نپولین نے ڈالا ہوا تھا کیوں کہ اسے کارتھیگ ٹولی میں شامل کیا گیا تھا۔ وہ چلاّ رہا تھا کہ اسے رومی ٹولی میں ڈالا جائے۔ اتنی ننھی سی عمر میں بھی وہ جانتا تھا کہ روم نے کارتھیگ کو جنگ میں شکست دے رکھی ہے اور وہ کسی ہارے ہوئے لشکر میں شامل ہونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ

اتنا غصے میں تھا کہ مجبوراً اسے رومی اور جوزف کو کارتھیگ بنانا پڑا۔ اُستاد اور نپولین کے ہم جماعت ہکے بکے دم بخود تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ نپولین فقط فرضی شکست سے بھی اتنی نفرت کر سکتا ہے، جیتنے کا خیال ہمیشہ اس کے ننھے ذہن میں سمایا رہتا۔ چھٹیوں میں وہ گھر رہنے کی بجائے قریبی پہاڑ کی ایک غار میں چلا جاتا اور مستقبل کے بارے میں خیالی پلاؤ بناتا رہتا۔ اگر آپ کورسیکا جائیں تو وہ غار آج بھی موجود ہے اور اسے نپولین کی غار کہتے ہیں۔ کئی دفعہ وہ چھٹی کے دن غار میں جاتا تو اپنی ماں سے ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا لیتا اور سارا دن اسی سے بھوک مٹاتا۔ وہ اتنا کم اس لیے کھاتا کہ وہ خود کو حالتِ جنگ میں تصور کرتا اور سوچتا کہ سپاہی اتنا ہی کھاتے ہیں۔ وہ ہمہ وقت جنگوں اور سپاہیوں کے متعلق گفتگو کرتا تھا، اس لیے اس کے گھر والوں نے فیصلہ کیا کہ اسے سپاہی ہی بننا چاہیے، لہٰذا دسمبر کی ایک یخ بستہ صبح کو اس نے اپنے بھائی جوزف کو ہمراہ اپنی ماں کو خدا حافظ کہا اور فرانس جانے کے لیے اپنے باپ کے ہمراہ ایک دخانی کشتی پر سوار ہو گیا۔

فرانس میں ان کا اسکول انہیں سخت ناپسند تھا۔ وہاں بچوں کو ہمیشہ فرانسیسی زبان بولنا پڑتی تھی اور ان فرانسیسی بچوں کے ساتھ کھیلنا پڑتا تھا جو نہ تو ان کی زبان سمجھتے تھے اور نہ کورسیکا کے بچوں کو اچھا سمجھتے تھے۔ اس تنہائی میں اور گھر کی یاد نے دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب کر دیا تھا۔ جوزف کو پادری بننا تھا اور نپولین کو فوجی، لہٰذا ایک دن اس ننھے لڑکے کو بھائی سے جدا ہو کر دوسرے اسکول جانا پڑا۔ جوزف نے بھائی کو خدا حافظ کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ ننھا نپولین جو صرف نو سال کا تھا، ہونٹ بھینچے رہا کیوں کہ وہ خود کو فوجی سمجھتا تھا۔ اس نے ہاتھ لہرا کر بھائی کو خدا حافظ کہا اور اس بگھی میں خاموشی سے بیٹھ گیا جو اسے نئے اسکول لے کر جا رہی تھی۔ اس نے کمال بہادری سے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو دبائے، صرف یہ سوچ کر کہ فوجی نہیں روتے۔ شروع شروع میں نپولین کا دل نئے اسکول میں نہیں لگا۔ اس کے ہم جماعت اسے شرمیلا اور انتہائی غصے والا سمجھتے تھے۔ وہ اس کا مذاق اُڑاتے کیوں کہ وہ فوجیوں کی طرح بہت تھوڑا کھاتا اور فرش پر سوتا۔ اس کے اساتذہ کے نزدیک وہ غصیلا اور چالاک تھا لیکن اگر وہ اس کا ذہن پڑھ سکتے تو جان لیتے کہ وہ

صرف عظیم فاتحین کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ وہ کان لگا کر اس کی سرگوشیاں سنتے جس میں وہ خود سے وعدہ کیا کرتا کہ وہ ان فاتحین کی طرح بنے گا۔ وقت گزرتا گیا اور نو سال کا بچہ پندرہ سال کا مضبوط و توانا نوجوان بن گیا جو پیرس کے فوجی کالج میں زیرِ تعلیم تھا۔ وہ تلوار باندھتا اور اپنا امتحان پاس کرنے کے لیے بہت محنت کیا کرتا تھا کیوں کہ اس امتحان کو پاس کرنے کے بعد اسے لیفٹیننٹ کے عہدے کو پانا تھا۔ اس نے انتہائی محنت جاری رکھی اور وہ اپنی رجمنٹ کا سب سے بہترین افسر بن گیا۔ اب وہ ہمیشہ خوش باش نظر آتا تھا۔ اب وہ تیزی سے ایک کامیاب فوجی افسر بنتا جا رہا تھا۔ اسے اسلحہ اور نقشہ جات کے بارے میں بہت مہارت ہوتی جا رہی تھی۔

ان دنوں فرانس میں بے چینی سی تھی۔ فرانس میں کچھ لوگ بہت امیر تھے اور دونوں ہاتھوں سے دولت لوٹا کرتے تھے۔ باقی اتنے غریب تھے کہ کھانے کو روٹی نہیں تھی اور پہننے کو کپڑا۔ فرانس کا شہنشاہ اور اس کے وزیر بھی بے دریغ مال و زر کے ضیاع میں مصروف تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ لوگوں کی بھوک بڑھتی گئی اور حالت مزید پتلی ہوتی گئی۔ آخر حکمرانوں سے تنگ فرانسیسی عوام میں انارکی پھیل گئی اور فرانس دُنیا کا سب سے آفت زدہ حصہ بن گیا۔ لوگوں نے شہنشاہ سے تاج چھین لیا، وزیروں کو قتل کر دیا اور ان کے محل جلا دیئے۔ پیرس میں لوگ تیز دھار چھرے جنہیں گلوٹین کہا جاتا تھا، سرِعام لیے پھرتے تھے جن سے وہ اپنے دشمنوں کے سر قلم کر دیتے۔ انہوں نے شہنشاہ اور ملکہ کا سر بھی تن سے جدا کر دیا اور اپنے نئے گورنر منتخب کر لیے۔ جب قریبی ملکوں کے شہزادوں اور حکمرانوں تک فرانس کی یہ خبریں پہنچیں تو وہ بہت غصے میں بھی تھے اور خوف زدہ بھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ ان کے لیے ان قاتلوں کا خاتمہ بہت ہی ضروری ہے کیوں کہ اگر یہ زندہ رہتے ہیں تو پھر ان کے ہاتھ ان سب کے گریبانوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ لہٰذا ایک ایک کر کے سبھی پڑوسی ملکوں نے فرانس کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ یہی وقت تھا جب نپولین اپنے خواب کو سچا کر سکتا تھا۔ وہ کل کا ناراض بچہ آج ایک چالاک فوجی افسر بن گیا تھا۔ جب اس نے ثابت کر دیا کہ وہ کتنا نڈر لڑکا ہے اور کتنی متانت سے اپنے ماتحت سپاہیوں سے کام لے سکتا ہے تو اسے فرانسیسی

فوجوں کا کمانڈر ان چیف بنا دیا گیا تا کہ وہ فرانس کے دشمنوں کے ساتھ جنگ کرے۔ اس کے ماتحت اس سے محبت کرتے تھے۔ وہ ایک زیرک جنرل کی طرح انہیں جنگ میں لڑاتا اور ان کا حوصلہ بلند رکھتا۔ وہ سب کو باور کرواتا کہ اسے ہر جنگ جیتنا ہے۔ اٹلی کے میدانوں میں، آسٹریا کے پہاڑوں پر، اس نے راستے میں آنے والی ہر فوج کو تباہ کر دیا۔ وہ جیتتا تو اس کے فوجی جو اسے آج بھی ننھا سپاہی کہتے تھے، اس کے لیے دعائیں مانگتے۔ جلد ہی اس ننھے سپاہی نے نقشے پر یورپ کو بدلنا شروع کر دیا اور کوئی مہینہ ایسا نہیں تھا جب وہ کوئی بڑی فتح حاصل نہیں کرتا تھا۔ فرانس کے عوام اس کی فتوحات پر فخر کرتے تھے۔ انہوں نے اس سڑک کا نام فتح کا راستہ رکھ دیا تھا جہاں وہ رہا کرتا تھا۔ لوگ اب کھلم کھلا کہتے تھے کہ وہ ننھا سپاہی ایک دن فرانس کا شہنشاہ بنے گا اور حقیقت میں نپولین تقریباً شہنشاہ بن ہی چکا تھا۔ یہ اس کی دلی خواہش تھی۔ وہ صرف سپاہی یا فاتح نہیں بننا چاہتا تھا بلکہ حکمران بننا چاہتا تھا۔

ایک دن اس نے محسوس کیا کہ لوگ اب اپنے منتخب کردہ حکمران سے بھی تنگ آ چکے ہیں، لہٰذا اس نے فوج کو لے کر پیرس کا رُخ کیا اور پھر توپوں کی گھن گرج میں حکمرانوں کو رخصت کیا اور حکومت کی بھاگ دوڑ سنبھال لی اور شہنشاہ کی طرح حکومت کرنے لگا۔ کئی مہینے اس نے سخت محنت کی اور نئے قوانین بنائے اور پھر فوج کی کمان سنبھالی۔ وہ جہاں سے گزرتا لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے گھنٹوں راہوں میں کھڑے رہتے۔ وہ مضبوط سے مضبوط ہوتا گیا اور ایک دن عوام نے خود بھی اسے ملک کا شہنشاہ بنا لیا۔ یہ مئی 1804ء کی بات ہے، جب شہنشاہ کی تاج پوشی کا وقت آیا تو اس نے کسی پادری کی بجائے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے سر پر تاج رکھا۔ انگریزوں کا قول ہے کہ ہر عروج کو زوال ہے، مغرور نپولین ساری دُنیا کو فرانس کے تابع لانا چاہتا تھا۔ ایک دن اس کا بھی وہی انجام ہوا جو اس سے پہلے تاریخ میں دوسرے بڑے فاتحین کا۔ اس نے تقریباً سارا یورپ فتح کر لیا تھا۔ کچھ ناکامیوں سے اس کی فوج کا حوصلہ کمزور ہوا لیکن نپولین کا جذبہ جوں کا توں رہا۔ ایک دفعہ وہ خود دشمن کے قابو آ گیا۔ اور اسے ایک چھوٹے سے جزیرے ''البا'' پر قید کر دیا گیا لیکن وہ اتنا چالاک تھا کہ ایک مچھلیاں پکڑنے والی کشتی کے ذریعے فرار ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ دشمنوں کو علم ہوتا کہ وہ ننھا سپاہی جو اب فرانس کا شہنشاہ تھا، اپنی فوجوں کی کمان کر رہا تھا لیکن قسمت کی دیوی اب نپولین بونا پارٹ سے روٹھ گئی تھی۔ اس کے لوگ اس کے لیے اب بھی مرنے کو تیار تھے لیکن وہ اپنی آخری جنگ میں فتح حاصل نہیں کر سکا۔ بلجیئم میں واٹرلو کے مقام پر انگریز فوج اور اس کے اتحادیوں نے اسے شکست دی۔ شکست کے آنسو آنکھوں میں لیے وہ تنہا پیرس پہنچا۔ فرانس کی فوج ہار چکی تھی۔ پیرس کے لوگ ننھے سپاہی کو فراموش کر بیٹھے تھے۔ اب ان کے سامنے نپولین ایک شکست خوردہ شہنشاہ تھا۔ انہوں نے اسے فرانس چھوڑنے کا حکم دیا۔ کچھ مہینے بعد نپولین جو تاریخ کا ایک عظیم فاتح تھا، اب قیدی تھا۔ انگریز اور یورپ کی دوسری قوموں کے لوگ اس بات سے خوف زدہ تھے کہ وہ دوبارہ دُنیا کا امن تباہ کر سکتا ہے، اس لیے انہوں نے اسے کئی سو میل دُور سمندر میں واقع ایک جزیرے میں قید کر دیا۔ اس جزیرے کا نام سینٹ ہیلینا تھا۔

نپولین نے پانچ سال وہاں اپنا وقت لکھنے پڑھنے، شطرنج کھیلنے میں گزارا۔ وہ اب ننھا سپاہی کوئی شہنشاہ نہیں تھا، وہ فقط ایک قیدی تھا جسے لوگ آہستہ آہستہ فراموش کرتے جا رہے تھے۔ پھر آخر شب شوریدہ سمندر کی لہریں ساحل سے سر پٹخ رہی تھیں اور ایک طوفان جزیرے پر آیا ہوا تھا۔ وہ اس جہان فانی سے بھی سرگوشی کرتا ہوا کوچ کر گیا۔ ''فرانس! میری محبت ہے۔'' پھر اسے فرانس سے بہت دُور تنہائی کی موت۔ دفن کر دیا گیا لیکن فرانس اس شخص کو ابھی بھلا نہیں پایا تھا جس نے ساری زندگی فرانس کو عظیم ترین ملک بنانے کی سعی میں صرف کر دیا۔ فرانس کا نیا شہنشاہ چاہتا تھا کہ وہ اس عظیم شہنشاہ کو جو اب اس جہان فانی میں نہیں تھا، کو عزت دے جس کا وہ حق دار تھا۔ اٹھارہ سال بعد نپولین کا جسدِ خاکی فرانس لایا گیا۔ شہزادے نے کہا۔ ''بادشاہ سلامت! میں آپ کی خدمت میں شہنشاہ نپولین کا جسدِ خاکی لایا ہوں۔'' شہنشاہ نے سر جھکایا اور بولا۔ ''ہاں! میں اسے فرانس کے نام پر قبول کرتا ہوں۔'' لہٰذا پیرس جسے نپولین نے تمام عمر پیار کیا، اس کی آخری آرام گاہ بن گیا۔

☆☆☆

میری بیاض سے

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

☆

سجدوں کے عوض فردوس ملے یہ بات مجھے منظور نہیں
بے لوث عبادت کرتا ہوں بندہ ہوں تیرا مزدور نہیں

(مائرہ حنیف، بہاول پور)

دل کے پھپھولے جل اُٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

(محمد عمر، چونیاں)

زندگی کے روز و شب میں علم ہی کی دھوم ہے
موت ہے وہ زندگی جو علم سے محروم ہے

(سمیعہ توقیر، کراچی)

اب تاثر جہاں میں وہ پریشانی نہیں
اہلِ گلشن پر گراں اسیری غزل خوانی نہیں

☆

اگر کچھ آشنا ہوتا مذاقِ جبہ سائی سے
تو سنگ آستان کعبہ جا ملتا جبینوں سے

(مہک خالد شیخ، لاہور)

یہی دعا ہے تو سدا مسکرائے
کوئی غم تیری زندگی میں نہ آئے

(ثروت یعقوب، لاہور)

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فراز
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

☆

صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

(تماضر ساجد، صادق آباد)

یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں
حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں، کافر نہیں ہوں میں

(محمد احمد، لاہور)

سجدۂ عشق ہو تو عبادت میں مزہ آتا ہے
خالی مسجدوں میں تو دُنیا ہی بسا کرتی ہے

☆

سبق پڑھ پھر صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا

(سارا ارشد، سرگودھا)

عشق قاتل سے بھی، مقتول سے ہمدردی بھی
یہ بتا کس سے محبت کا صلہ مانگے گا
سجدے خالق کو بھی، ابلیس سے یارانہ بھی
یہ بتا کس سے عبادت کی جزا مانگے گا

☆

پرندوں کی دُنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

(خدیجہ تحریم، رینالہ خورد)

ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے، اُمیدِ بہار رکھ

☆

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

(عاتکہ رحیم، جوہر آباد)

☆☆☆

حضرت یوسف علیہ السلام

آپ مشہور پیغمبر، حضرت اسحاقؑ کے پوتے اور حضرت یعقوبؑ کے بیٹے تھے۔ آپ کی والدہ محترمہ کا نام راحیل تھا۔ جب حضرت یوسفؑ کی عمر بارہ برس ہوئی تو انہوں نے خواب دیکھا کہ گیارہ ستارے اور چاند سورج انہیں سجدہ کر رہے ہیں۔ یہ خواب سن کر حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ سے اور زیادہ پیار کرنے لگے اور حضرت یوسف سختی سے منع کر دیا کہ اپنے دوسرے سوتیلے بھائیوں کو یہ خواب نہ سنانا۔ حضرت یعقوبؑ نے کہا کہ حضرت یوسفؑ کی آئندہ زندگی میں بڑے بڑے کمال اور مراتب پوشیدہ ہیں اور ان کی وجہ سے انہیں ایسا مقام ملے گا کہ گیارہ بھائیوں، باپ اور ماں کو ان کے سامنے دستِ تعاون دراز کرنا پڑے گا۔ ایک روز بھائی فریب دے کر ان کو ساتھ لے گئے اور ایک کنوئیں پر جا کر ان کی قمیص اتار لی اور انہیں کنوئیں میں پھینک دیا۔ اپنے گھناؤنے جرم کو چھپانے کے لیے ان کے بھائیوں نے ایک بکری کو ذبح کیا اور حضرت یوسف کی قمیص کو اس کے خون سے تر کر کے گھر واپس آ گئے اور انتہائی مکر و فریب کے ساتھ اپنے والد سے کہا کہ یوسفؑ کو بھیڑیا کھا گیا ہے لیکن حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کی اس بات پر یقین نہ کیا اور فرمایا یہ سب تمہاری بنائی ہوئی باتیں ہیں۔ تین دن کے بعد ایک تجارتی قافلے نے انہیں کنوئیں سے نکالا اور مصر کے بازار میں عزیز مصر کے ہاتھ جا کر فروخت کر دیا۔ عزیز مصر فوطیفار انہیں اپنے گھر لے گیا اور اپنی بیوی زلیخا سے کہا کہ انہیں آرام اور عزت کے ساتھ رکھے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی وقت ہمیں اس سے فائدہ پہنچ جائے۔ جب زلیخا کی عمر تیس برس کو پہنچی تو اس نے حضرت یوسفؑ کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی لیکن جب حضرت یوسفؑ نے بی بی زلیخا کی بات نہ مانی تو ان پر اپنی رسوائی کا الزام لگا کر انہیں جیل بھجوا دیا لیکن تحقیق کے بعد جب عزیز مصر کو اصل واقعہ کا علم ہوا تو اس نے حضرت یوسفؑ کو مصر کا وزیر خوراک مقرر کیا۔ عزیز مصر کے انتقال پر انہوں نے بی بی زلیخا سے شادی کر لی۔ قحط سالی کے دوران حضرت یوسفؑ کے بھائی غلہ لینے کی غرض سے مصر آئے تو حضرت یوسفؑ نے انہیں پہچان لیا لیکن ان کے بھائی نہ پہچان سکے۔ حضرت یوسفؑ نے مصلحتاً اپنے بارے میں اپنے بھائیوں کو کچھ نہ بتایا مگر ان سے اپنے گھر کے متعلق مکمل آگاہی حاصل کر لی۔ جب ان کے بھائی واپس جانے لگے تو حضرت یوسفؑ نے فرمایا، اچھا! جب تم پھر آؤ تو اپنے والد کو بھی اپنے ساتھ لیتے آنا۔ حضرت یعقوبؑ تو حضرت یوسفؑ کے غم میں نڈھال ہو کر نابینا ہو گئے تھے۔ اس لیے وہ خود تو نہ آ سکے لیکن انہوں نے اپنے بیٹوں کے اصرار پر اپنے سب سے چھوٹے بیٹے بنیامین کو ان کے ہمراہ مصر بھیج دیا۔ جب دوسرے روز حضرت یوسفؑ کے بھائی غلہ لے کر چلنے لگے تو انہوں نے حضرت یوسفؑ کا پیالا بنیامین کے سامنے رکھ دیا۔ بنیامین چوری کے الزام میں دھر لیے گئے لیکن بعد ازاں حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں پر اپنا آپ ظاہر کر دیا۔ بھائیوں نے حضرت یوسفؑ سے معافی مانگی۔ انہوں نے سب کو معاف کر دیا اور چلتے ہوئے انہیں تلقین کی کہ سب گھر والے کنعان چھوڑ کر مصر چلے آئیں اور نشانی کے طور پر انہیں اپنا پیراہن بھی دیا۔ جب وہ پیراہن حضرت یعقوبؑ نے اپنی آنکھوں پر ڈالا تو ان کی بینائی بحال ہو گئی۔ چناں چہ گھر کے سبھی افراد مصر چلے آئے۔ حضرت یوسفؑ نے ان کا فقید المثال استقبال کیا۔ ایک سو بیس سال عمر پائی۔ وصیت کے مطابق بنی اسرائیل کے خروج کے وقت مصر سے نکال کر بیت المقدس میں دفن کیے گئے۔

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 اگست 2016ء ہے۔

کھوج لگائیے

نام: ____________

شہر: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 اگست 2016ء ہے۔

دماغ لڑاؤ

نام: ____________

مقام: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

اس ماہ کا موضوع "یوم پاکستان" ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08 اگست 2016ء ہے۔

ہونہار مصور

نام ____________ عمر ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ____________ شہر ____________

مقاصد ____________

موبائل نمبر: ____________

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

کھیل دس منٹ کا
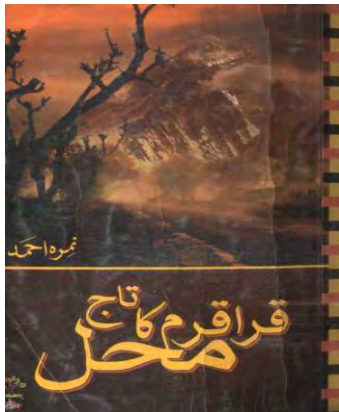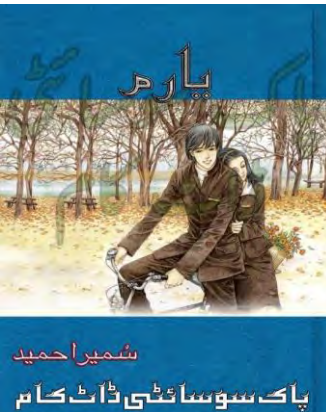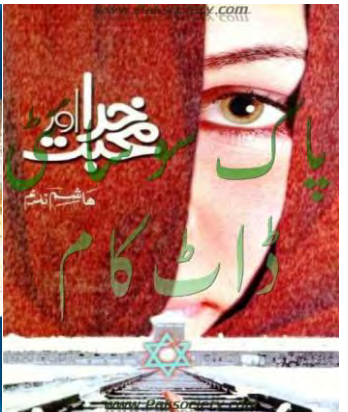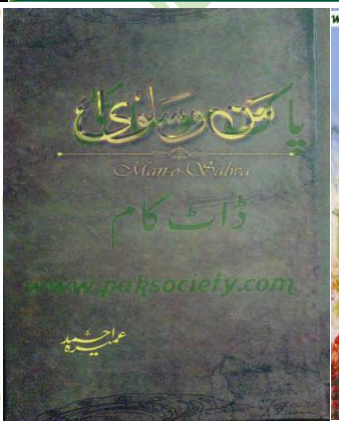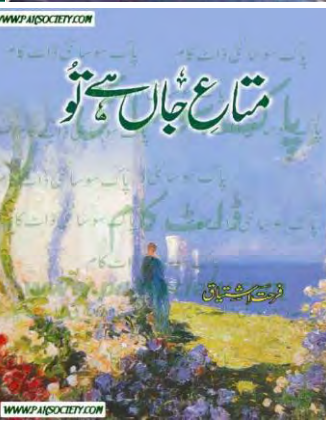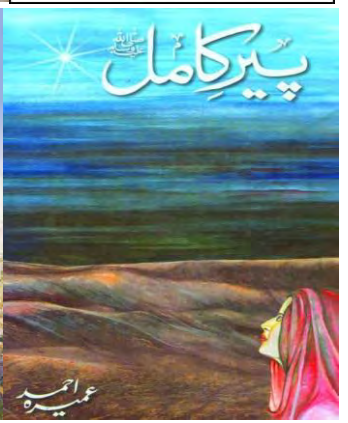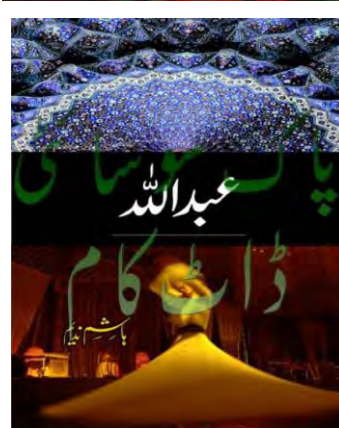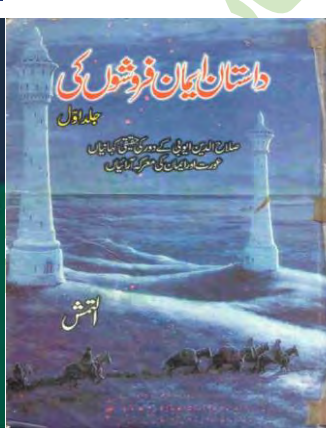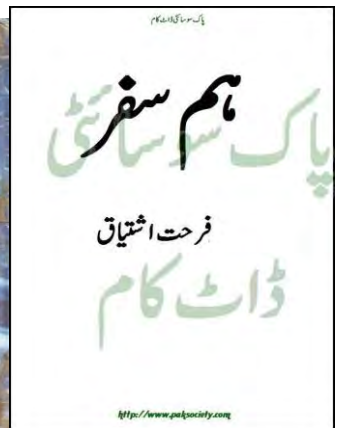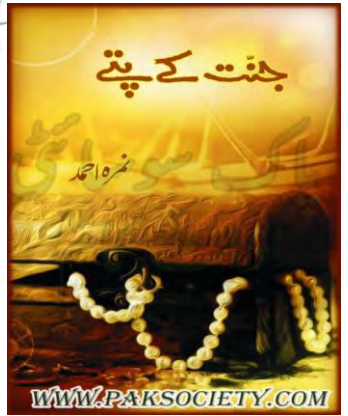
پ	خ	ظ	ر	ی	ش	م	ش	گ	ڈ
س	ڈ	ض	ٹ	غ	ث	ذ	ء	ے	ت
و	ء	ف	ر	د	و	س	ژ	ع	ل
ر	ت	ی	ہ	ض	ٹ	ظ	ن	م	ف
ج	ق	ک	ا	ل	ف	ا	چ	ا	غ
م	ی	چ	ف	ژ	ق	ذ	ص	ر	ل
ڑ	ق	ش	ر	م	ٹ	د	ع	ت	ح
ث	ح	ب	ع	ہ	ش	ب	ن	م	ب
ع	ط	ے	و	ص	خ	ژ	ظ	ے	د
ط	ز	ک	ن	ء	ل	ی	ر	ب	ج

آپ نے حروف ملا کر دس الفاظ تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان الفاظ کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن الفاظ کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں:

فردوس، جبریل، حقیقت، افلاک، شمشیر، عمارت، فرعون، شبنم، سورج، غفلت

غلام حسین میمن

مولانا محمد علی جوہر

شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ وہ سرکاری ملازمت نہ کریں، اسی لیے مقابلے کے امتحان میں ناکام ہو گئے۔ وہ وکالت کے امتحان میں بھی ایک مضمون میں رہ گئے، حالاں کہ انگریزی زبان پر عبور اور قابلیت ان کی مثالی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ صحافت اور سیاست کا کانٹوں بھرا راستہ ان کا انتظار کر رہا ہے۔

یہ ذکر ہے اس شخصیت کا، جس نے 10 دسمبر 1878ء کو رام پور میں عبدالعلی خان کے گھر آنکھ کھولی۔ پانچ بہن بھائیوں میں محمد علی سب سے چھوٹے تھے۔ ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی بھی سیاست میں قدم رکھ چکے تھے۔ دونوں بھائیوں نے تحریک آزادیٔ پاکستان میں بھرپور حصہ لے کر ”علی برادران“ کے نام سے شہرت اور عزت پائی۔

محمد علی کی عمر ابھی دو سال بھی نہیں ہوئی تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ والدہ بی اماں جن کا اصل نام آبادی بیگم تھا، انہوں نے بڑی ہمت اور جرأت کے ساتھ نہ صرف اپنی اولاد کی اچھی تربیت کی بلکہ اعلیٰ تعلیم بھی دلوائی۔

محمد علی جوہر ذہین تھے اور اچھی کتابیں پڑھنے کا بھی بے حد شوق تھا۔ تعلیمی قابلیت بھی کم نہیں تھی، پھر کیوں نہ ہندوستان کی اعلیٰ ملازمت کے حصول کے لیے ہونے والے مقابلے میں حصہ نہ لیتے۔ نتیجے کے وقت وہ لندن میں تھے۔ وہ اس اہم مقابلے میں کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ اس ناکامی کے بعد والدہ نے لندن سے بلوا کر شادی کرا دی۔ شادی کے بعد ایک بار پھر وہ 1902ء میں لندن روانہ ہوئے اور آکسفورڈ یونی ورسٹی سے بی اے آنرز کی ڈگری لی۔

محمد علی جوہر کی انگریزی دانی کا چرچا تو اسی وقت سے ہونے لگا تھا جب وہ علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے۔ انہوں نے علی گڑھ سے شائع ہونے والے ماہنامہ میگزین میں مضمون لکھا تو ان کی نثر کی بے حد تعریف ہوئی۔ ان کے انگریز پرنسپل ماریسن نے اس وقت کہا تھا۔ ”تم ایک زمانے میں انگریزی کے بے مثل ادیب بنو گے۔“

آکسفورڈ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ دوبارہ ہندوستان آ گئے۔ رام پور کے نواب حامد علی خان نے انہیں اپنی ریاست میں افسرِ تعلیمات بنا دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ رام پور ہائی اسکول کے پرنسپل بھی بن گئے۔ یہ ملازمت زیادہ عرصے نہ چل سکی۔ انہوں نے الٰہ آباد یونی ورسٹی سے وکالت کا امتحان دیا مگر ایک مضمون میں ناکام ہو گئے۔ اس کے بعد ریاست بڑودہ میں محکمۂ افیون

کے افسر رہے۔ یہاں انہوں نے چار سال کام کیا۔ اس کے بعد ایک اور ضلع کے کمشنر بنے۔ مجموعی طور پر انہوں نے سات سال اسی ریاست میں گزارے مگر ایسا لگتا تھا کہ وہ ملازمت کے لیے پیدا نہیں کیے گئے۔ انگریزوں کی غلامی سے بیزاری، ایمان داری اور آزاد خیالی جیسے عناصر ان کی طبیعت کا حصہ تھے۔

صحافت سے ان کا عشق تو دوران تعلیم ہی شروع ہو چکا تھا۔ وہ ٹائمز آف انڈیا (بمبئی) میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ 14 جنوری 1911ء کو انہوں نے کلکتہ سے انگریزی ہفت روزہ ''کامریڈ'' جاری کیا۔ اس اخبار نے جلد ہی مقبولیت حاصل کر لی۔ وائسرائے لارڈ ہارڈنگ کی بیوی کو تو کامریڈ اتنا پسند تھا کہ وہ اکثر دفتر فون کر کے پوچھتی کہ کامریڈ کس وقت چھپ کر میرے پاس آ جائے گا۔ وائسرائے ہند کو اس کی اعزازی کاپی بھیجی جاتی تھی۔

ان ہی دنوں کی بات ہے کہ لندن ٹائمز میں چھپے ایک مضمون میں ترکوں کو دھمکی دی گئی تھی کہ وہ جنگ میں غیر جانبدار رہیں، ورنہ نتائج ان کے لیے اچھے نہیں ہوں گے۔ یہ پہلی جنگ عظیم کا زمانہ تھا جو 1914ء میں شروع ہوئی تھی۔

محمد علی جوہر نے اس مضمون کا جواب اسی عنوان سے اپنے اخبار کامریڈ میں لکھا۔ نتیجے کے طور پر حکومت ناراض ہوئی اور اس نے کامریڈ کا پریس ضبط کر لیا، یوں کامریڈ بند ہو گیا۔

اسی دوران وہ ایک اور اخبار اُردو میں ''ہمدرد'' کے نام سے جاری کر چکے تھے۔ ''ہمدرد'' کے مضامین اور خبریں معیاری ہوتی تھیں۔ سیاسی موضوعات کے علاوہ عام معلومات، نظمیں، افسانے اور ادبی مضامین بھی تواتر کے ساتھ شائع کیے جاتے تھے۔ دوسری جانب محمد علی جوہر کی سیاسی مصروفیات بھی جاری تھیں۔ ہمدرد نے اُردو صحافت کا معیار قائم کیا۔ ہمدرد اُردو کا پہلا اخبار تھا جس نے غیر ملکی خبر رساں ایجنسی سے خبریں لینی شروع کی۔ یہ اُردو پڑھنے والوں کی خوش قسمتی تھی کہ ہمدرد کو بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کا مکمل تعاون حاصل رہا۔ ان میں خواجہ حسن نظامی، مولانا الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، علامہ محمد اقبال، مولانا عبدالماجد وزیر آبادی، منشی پریم چند، سید سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری و ڈاکٹر عابد حسین جیسی نامور شخصیات شامل ہیں۔

1915ء میں محمد علی جوہر گرفتار کر لیے گئے۔ اس کے ساتھ ہی ہمدرد بند ہو گیا۔ کامریڈ پہلے ہی ضبط ہو چکا تھا۔ یہ دونوں اخبارات بعد میں دوبارہ جاری ہوئے مگر اس وقت محمد علی جوہر کی سیاسی مصروفیات میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا اس لیے وہ ان پر بھرپور توجہ نہ دے سکے۔

1906ء میں جب مسلم لیگ وجود میں آئی تو محمد علی جوہر بھی اس کے بانیوں میں سے تھے۔ پہلے جلسے کے بعد ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا نام مسلم لیگ کا دستور بنانا تھا۔ محمد علی جوہر اس کمیٹی کے رکن تھے اور انہوں نے اس کام میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ اس کے سالانہ اجلاس میں شرکت کرتے تھے اور مسلم لیگ کے پیغام کو ہر جگہ پھیلاتے رہے۔

1915ء میں انہیں نظر بند کیا گیا۔ یہ عرصہ ساڑھے چار سال تک پھیلا رہا۔ اسی دوران 1917ء میں انہیں مسلم لیگ کے ایک اجلاس کے صدر کی حیثیت سے چنا گیا مگر نظر بندی کے باعث محمد علی جوہر کی تصویر کرسی صدارت پر رکھ کر اجلاس کی کارروائی جاری رکھی گئی۔ 1919ء میں رہا ہوتے ہی وہ سیدھے امرتسر پہنچے جہاں مسلم لیگ، کانگریس اور خلافت کے جلسے ہو رہے تھے۔ محمد علی جوہر کا یہاں پُرتپاک استقبال کیا گیا۔

یہ بات طے ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کرنے میں ان کا کردار بے حد مضبوط رہا ہے۔ محمد علی جوہر کا شمار ان رہنماؤں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی بے پناہ جرأت اور ہمت سے برصغیر کے لوگوں کا حوصلہ بلند کیا اور انہیں مکمل آزادی حاصل کرنے کا شعور دیا۔ انہوں نے عوام میں سیاسی عمل اور جوش پیدا کرنے کے لیے تن من دھن قربان کر دیا۔ اس کوشش میں اپنی اولاد، خاندان اور روزگار یہاں تک کہ اپنی صحت تک کی بھی پرواہ نہیں کی۔ پاکستان کی تحریک کی کام یابی میں ایسے مخلص کارکنوں اور رہ نماؤں کا اہم حصہ ہے جن کی بدولت آج ہم پاکستان جیسے آزاد ملک میں رہ رہے ہیں۔

پہلی جنگ عظیم 1919ء میں ختم ہوئی اور اتحادی فوجوں کو کام یابی ملی تو انہوں نے اس کا بدلہ ترکی میں قائم سلطنت عثمانیہ سے خوب خوب لیا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو ترکی کی خلافت عثمانیہ سے بے پناہ محبت تھی۔ اسی لیے اس سلطنت کو بچانے کے لیے خلافت کمیٹی قائم کی گئی جس کا مقصد حکومت برطانیہ پر دباؤ ڈال کر سلطنت عثمانیہ کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچانا تھا۔ خلافت کمیٹی میں محمد علی جوہر کا کردار سب سے زیادہ اور نمایاں تھا۔ انہیں اپنی بے باک تقاریر پر ایک بار پھر قید کر لیا گیا اور اس بار ان پر

(بقیہ: صفحہ نمبر 6)

اُدھار

عاطر شاہین

رات کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وحید کے اکلوتے چھ سالہ بیٹے شہباز نے کہا۔

''پاپا! عید آنے والی ہے، مجھے نیا سوٹ اور جوتے کب لے کر دیں گے؟''

وحید نے بے اختیار چونک کر شہباز کی طرف دیکھا۔

''پاپا کی جان، کچھ دنوں تک اپنے بیٹے کو نیا سوٹ اور جوتے خرید دوں گا۔'' وحید نے کہا۔

''پاپا! اس عید پر مجھے وہ سوٹ چاہیے جو کامران کے ابو نے اسے خرید کر دیا ہے۔'' شہباز نے لاڈ بھرے لہجے میں کہا۔

''کامران کے ابو نے کیسا سوٹ خرید کر دیا ہے؟'' شہباز کی امی نے اس بار پوچھا۔ وہ برتن سمیٹ رہی تھیں۔

''تھری پیس سوٹ۔'' شہباز نے جواب دیا۔

''تھری پیس سوٹ......؟'' وحید نے دہرایا۔

''مگر وہ تو بہت مہنگا ہوتا ہے۔'' شہباز کی امی بولیں۔

''مجھے کچھ نہیں پتا، آپ مجھے تھری پیس سوٹ ہی لے کر دیں۔'' شہباز نے ضد بھرے لہجے میں کہا۔ وحید کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ شہباز کو کیا جواب دے۔

''اچھا بیٹا! آپ اب پاپا کو تنگ نہ کرو اور اپنے کمرے میں جاؤ۔'' وحید کی بیگم نے بات ٹالنے کے انداز میں کہا۔

''پاپا! آپ وعدہ کریں کہ آپ مجھے تھری پیس سوٹ لے کر دیں گے۔'' شہباز نے وحید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا پاپا کی جان! لے دوں گا، وعدہ کرتا ہوں۔'' وحید نے شہباز کو پیار کرتے ہوئے کہا تو شہباز خوش ہوگیا۔ پھر وہ دسترخوان سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

''وحید! آپ نے شہباز سے وعدہ کیوں کیا ہے۔ کہاں سے پیسے لائیں گے۔ آپ جانتے ہیں تھری پیس سوٹ کم سے کم پانچ ہزار روپے سے کم میں نہیں ملے گا۔'' وحید کی بیگم نے کہا۔

''جانتا ہوں مگر کیا کروں اگر شہباز کو انکار کرتا تو اس کا دل ٹوٹ جاتا۔'' وحید نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''پھر اب کیا کریں گے۔ پانچ ہزار روپے کہاں سے لائیں گے؟'' وحید کی بیگم نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''کسی سے اُدھار مانگتا ہوں۔ سال کے بعد تو عید آتی ہے اب بچے کی خواہش تو پوری کرنی ہی ہے۔'' وحید نے جواب دیتے ہوئے کہا، پھر وہ اُٹھ کر گھر سے باہر چل دیا۔ اس کی عادت تھی کہ

رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ چہل قدمی کے لئے گھر سے باہر نکل جاتا تھا۔

وحید اپنی بیوی اور شہباز کے ساتھ علیحدہ مکان میں رہتا تھا۔ وہ ایک بیکری میں بارہ ہزار روپے تنخواہ پر ملازمت کرتا تھا۔ اس کے والدین فوت ہو چکے تھے۔ اس کے بہن بھائی نہ تھے۔ وہ بھی اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی عمر اس وقت بارہ سال تھی جب اس کے والد فوت ہو گئے تھے، اس لئے اس نے اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ محنت مزدوری بھی کی تھی اور ایف اے کرنے کے بعد اس نے ایک بیکری میں نوکری کر لی تھی۔

سڑک پر چہل قدمی کرتے ہوئے وحید یہی سوچ رہا تھا کہ پانچ ہزار روپے کس سے اُدھار لے۔ اس نے اپنے بیٹے سے وعدہ کیا تھا اور وہ اپنا وعدہ ہر حال میں نبھانا چاہتا تھا۔ سوچتے سوچتے اچانک اسے اپنے دوست ارشاد کا خیال آیا تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ارشاد سے پانچ ہزار روپے اُدھار لے گا، پھر وہ کچھ عرصے کے بعد پانچ ہزار روپے اسے واپس کر دے گا۔ ارشاد اس کا بچپن کا دوست تھا۔ وہ دوسرے علاقے میں رہتا تھا اور اس نے گھر کے ساتھ ہی کریانے کی دُکان بنائی ہوئی تھی۔ وحید کام پر جاتا تھا تو اس کی ارشاد سے روزانہ سلام دعا ہوتی تھی۔ وحید کبھی کبھار ہی اس کی دُکان پر جاتا تھا۔ وحید کو یقین تھا کہ ارشاد اسے پانچ ہزار روپے ضرور اُدھار دے دے گا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن شام کو بیکری سے واپسی پر وحید اپنے دوست ارشاد کی دُکان پر پہنچ گیا۔ ارشاد بھی اسے دیکھ کر بے حد خوش ہوا تھا۔ اس نے وحید کی کولڈ ڈرنک سے خاطر تواضع کی۔ کولڈ ڈرنک پینے کے دوران وحید نے دُکان میں نظر دوڑائی تو اسے ایک دیوار پر ''اُدھار محبت کی قینچی ہے'' کا بورڈ دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور بورڈ بھی لگا ہوا تھا جس پر ''اُدھار بند ہے'' لکھا ہوا تھا۔

''ارے وحید! کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو۔ خیریت تو ہے نا۔'' ارشاد نے پوچھا۔

''نہیں، ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔'' وحید نے خالی بوتل ایک سائیڈ پر رکھتے ہوئے کہا۔ بہر حال سناؤ! آج کیسے آنا ہوا؟'' ارشاد نے کہا۔

''تمہارے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔'' وحید نے کہا۔

''ضروری کام...... بتاؤ!'' ارشاد نے کہا۔

''مجھے پانچ ہزار روپے اُدھار چاہئیں۔'' وحید نے اپنا مدعا بیان کیا تو ارشاد چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

''پانچ ہزار روپے۔'' ارشاد نے دُہرایا۔ ''تمہیں پانچ ہزار روپے کی کیوں ضرورت پڑ گئی ہے؟''

''بس ضرورت پڑ گئی ہے۔'' وحید نے کہا۔ ''تم یہ بتاؤ کہ تم دینے پر تیار ہو یا نہیں۔''

''واپس کب تک کرو گے؟'' ارشاد نے پوچھا۔

''میں تمہیں پانچ ماہ کے بعد پیسے واپس کر دوں گا۔'' وحید نے جواب دیا تو ارشاد سوچ میں پڑ گیا۔

''دیکھو وحید! مجھے اُدھار دینے میں کوئی مسئلہ نہیں ہے مگر ایسا نہ ہو کہ تم مقررہ وقت تک پیسے واپس نہ کر سکو اور مجھ سے چھپتے پھرو۔ یہ بورڈ دیکھ رہے ہو۔'' ارشاد نے 'اُدھار محبت کی قینچی ہے' کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک محاورہ ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُدھار محبت کی قینچی ہے۔ جب کوئی مقررہ وقت پر اُدھار واپس نہیں کرتا تو اُدھار دینے والے کے دل میں کئی خدشات جنم لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو دوستی میں خلوص اور چاہت ہوتی ہے، وہ بھی جاتی رہتی ہے۔ دلوں میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں اس لئے تم بھی سوچ سمجھ کر اُدھار لو کیوں کہ مجھ سے بہت سے لوگ اُدھار سامان

لے کر جاتے ہیں لیکن کئی لوگ ایسے ہیں جنہوں نے دو دو برس گزر جانے کے باوجود اُدھار واپس نہیں کیا، اسی لئے میں نے اُدھار بند کیا ہوا ہے۔''

وحید نے سوچا کہ ارشاد بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے لیکن اسے خود پر یقین تھا کہ وہ ارشاد کے پیسے جلد واپس کر دے گا۔

''تم بے فکر رہو ارشاد، اگر میرے پاس پانچ ماہ سے پہلے پیسے جمع ہو گئے تو میں تمہیں واپس کر دوں گا۔'' وحید نے یقین بھرے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔ تم نے پہلی بار مجھ سے اُدھار مانگا ہے اس لئے میں تمہیں انکار نہیں کر سکتا۔'' ارشاد نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور پھر اس نے اپنی قمیص کی جیب سے پانچ ہزار روپے نکال کر وحید کو دے دیئے۔ پیسے جیب میں رکھنے کے بعد وحید نے ارشاد کا شکریہ ادا کیا اور اس سے مصافحہ کر کے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆..........☆..........☆

وحید نے شہباز کو تھری پیس سوٹ اور نئے جوتے خرید کر دے دیئے تھے جنہیں پا کر شہباز بے حد خوش تھا۔ اس نے پانچ ہزار روپے سے اپنے لئے اور اپنی بیگم کے لئے بھی سوٹ خرید لئے تھے۔ اس طرح ان کی عید بہت اچھی گزر گئی تھی۔

وقت کا پہیہ چلتا رہا اور پانچ ماہ گزر گئے لیکن وحید کے پاس اتنے پیسے جمع نہ ہو سکے جس سے وہ ارشاد کا اُدھار اُتار دیتا۔ وحید پریشان بھی تھا کہ وہ کیا کرے اور ارشاد کے پیسے کیسے لوٹائے۔ وحید، ارشاد کی دُکان کی قریبی سڑک سے گزر کر اپنی بیکری میں جاتا تھا لیکن اب اس نے شرمندگی سے بچنے کے لئے اس سڑک سے گزرنا بھی بند کر دیا تھا حالاں کہ ارشاد نے پانچ ماہ گزر جانے کے باوجود وحید سے اپنی رقم کا تقاضا نہیں کیا تھا۔ وحید میں ارشاد کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ وحید نے صحیح کہا تھا کہ 'اُدھار محبت کی قینچی ہے' کیوں کہ اس کے اُدھار رقم لینے اور پھر مقررہ وقت پر واپس نہ کرنے سے ان کے درمیان دُوریاں ہو گئی تھیں۔

☆..........☆..........☆

ایک دن وحید اپنی سائیکل پر سوار بیکری کی طرف چلا جا رہا تھا۔ وہ آج بھی اسی راستے سے جا رہا تھا جس راستے سے وہ جاتا تھا کہ اچانک اسے سامنے سے ارشاد پیدل آتا ہوا دکھائی دیا۔ ارشاد کو دیکھ کر وحید کے چہرے پر پریشانی اور شرمندگی کے ملے جلے تاثرات اُبھر آئے۔ وحید کے لئے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنی سائیکل روک کر اس سے ملاقات کر لے۔ اس نے ارشاد کے پاس پہنچ کر سائیکل روک دی اور نیچے اُتر آیا۔

''کیسے ہو ارشاد۔'' وحید نے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں مگر مجھے تم ٹھیک دکھائی نہیں دے رہے۔'' ارشاد نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''جب سے تم نے مقررہ تاریخ پر پانچ ہزار روپے واپس نہیں کئے تم نے تو راستہ بھی بدل لیا ہے۔''

''میں شرمندہ ہوں ارشاد کہ میں مقررہ وقت پر رقم ادا نہیں کر سکا۔'' وحید نے شرمندگی آمیز لہجے میں کہا۔

''اسی لئے تو 'اُدھار محبت کی قینچی ہے' محاورہ بالکل درست ہے۔'' ارشاد نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''رقم مقررہ تاریخ تک واپس نہ کرنے سے دوستوں میں دُوریاں بڑھتی ہیں، دلوں میں میل آتے ہیں۔ تم سے مقررہ تاریخ تک پیسے جمع نہیں ہو سکے اور تم میں میرا سامنے کرنے کی ہمت نہ تھی، اسی لئے تم نے راستہ بدل لیا لیکن میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں تمہارے حالات سمجھتا ہوں مگر افسوس اس بات کا ہے کہ تم نے مجھے بتانے کی بجائے اپنا راستہ بدل لیا۔ اگر تم مجھ سے ملتے تو کیا میں تم سے ناراضگی کا اظہار کرتا۔ نہیں دوست! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''ارشاد! تم کھلے دل کے مالک ہو مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہاری رقم جلد لوٹا دوں گا۔'' وحید نے بدستور شرمندگی آمیز لہجے میں کہا۔

''پہلی بات یہ کہ تم وعدہ نہ کرو اور اگر وعدہ کرو تو اسے پورا کرو۔ تمہارے پاس جب پیسے آ جائیں تو مجھے لوٹا دینا۔'' ارشاد نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''اور ہاں! شام کو بیکری سے واپسی پر میرے پاس سے ہوتے جانا۔ گپ شپ لگائیں گے۔''

یہ کہہ کر ارشاد آگے بڑھ گیا جبکہ وحید اسے جاتا دیکھتا رہ گیا۔ اس کی آنکھیں نم تھیں اور وہ اپنے دوست پر رشک کر رہا تھا کہ اس کے دل میں اس کی رقم نہ لوٹانے کی وجہ سے میل نہیں آئی تھی اور نہ ہی اُدھار کی وجہ سے ان کی دوستی پر قینچی چلی تھی۔ ☆☆☆

آئیے مسکرائیے

اُستاد (شاگرد سے): ''آج آپ نے گھر کا کام کیوں نہیں کیا؟''
شاگرد: ''جناب! میں گھر میں نہیں، ہاسٹل میں رہتا ہوں۔''

☆

شعیب (اپنے دوست اسداللہ سے): ''یار آج کل پانی بھی خالص نہیں ملتا۔''
اسداللہ: (حیرت سے) ''وہ کیسے؟''
شعیب: ''پانی سے بھی بجلی نکالی جاتی ہے۔''

(مائرہ حنیف، بہاول پور)

کسی فقیر نے بھیک مانگنے کے لیے ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک بچہ باہر نکلا۔ بچے نے فقیر سے پوچھا۔ ''شربت پیو گے؟''
فقیر نے خوش ہو کر دانت نکالے اور گردن ہلا کر کہا۔ ''ہاں! کیوں نہیں، شربت میں ذرا برف ڈال کر لے آنا۔''
بچے نے فقیر کو تین گلاس شربت پلا دیئے تو فقیر نے پوچھا۔ ''کیا آج شربت گھر میں زیادہ بنا ہے؟''
بچے نے معصومیت سے جواب دیا۔ ''ہاں! شربت تو زیادہ ہی بنا تھا، بس اس میں مینڈک گر گیا تھا۔'' (سارا ارشد، سرگودھا)

ڈاکٹر: ''بچے کو پانی دینے سے پہلے اُبال لیا کریں۔''
عورت: ''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اُبالنے سے بچہ مر تو نہیں جائے گا۔''

☆

اُستاد (شاگرد سے): ''جب انگریزوں نے برصغیر میں پہلا قدم رکھا تو انہوں نے کیا کیا؟''
شاگرد: ''جناب انہوں نے دوسرا قدم رکھا۔'' (رخام اعظم، لاہور)

گاہک: ''ارے بھائی صاحب! گائے کی قیمت دس ہزار زیادہ ہے۔ اور تو اور، اس کی ایک آنکھ بھی نہیں ہے۔''
دکان دار: ''جناب! آپ نے دودھ پینا ہے یا کشیدہ کاری کروانی ہے۔''
(مہک خالد شیخ، عائشہ خالد شیخ، لاہور)

نرسری کی ٹیچر 18 ویں بچے کو جوتے پہنا رہی تھی۔ جھکے جھکے اس کی کمر میں درد ہو رہا تھا۔ جب ٹیچر جوتا پہنا چکی تو بچہ بولا:
''یہ جوتے میرے نہیں ہیں۔'' ٹیچر کا جی چاہا رو پڑے مگر اس نے خود پہ قابو پا کر بچے کو جوتے پہنا دیئے۔ بے چاری نے اپنی کمر سیدھی کی ہی تھی کہ بچہ بولا:
''یہ جوتے میرے بھائی کے ہیں مگر امی نے کہا تھا آج تم پہن جاؤ۔''

☆

ایک اعلیٰ عہدے دار پطرس بخاری سے ملاقات کرنے آئے۔ پطرس نے کہا: ''تشریف رکھیے۔''
ان صاحب کو یوں محسوس ہوا جیسے بے اعتنائی برتی گئی ہے۔ چناں چہ انہوں نے کہا: ''میں محکمہ برقیات کا ڈائریکٹر ہوں۔''
پطرس مسکرائے اور کہا: ''پھر آپ دو کرسیوں پر بیٹھ جائیے۔''
(احور کامران، لاہور)

ایک پولیس انسپکٹر کی شادی تھی۔ بارات جا رہی تھی اور وہ اپنے دوست کے ہمراہ کار میں بیٹھا تھا۔ پیچھے آنے والی باراتیوں کی بس کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے دوست کو کہنے لگا:
''پیچھے سے جو بس آ رہی ہے وہ مشکوک لگتی ہے، گھر سے یہاں تک ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔'' (کظیمہ زہرہ، لاہور)

ایک بچہ دوا نہیں کھا رہا تھا۔ اس لیے اس کی ماں نے اسے دوا کھلانے کے لیے ایک طریقہ ڈھونڈا اور لڈوؤں کے بیچ میں گولی رکھ دی۔ ماں نے پوچھا: ''بیٹا! کیا تم نے لڈو کھایا ہے؟''
بیٹے نے جواب دیا: ''ہاں امی! لیکن اس کے بیچ میں جو گٹھلی تھی وہ میں نے باہر پھینک دی۔'' (بشریٰ ناز، ملتان)

ایک بچے کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ چھٹی کے لیے کیا عذر پیش کرے۔ آخر اس نے اُستاد سے درخواست کی:
''مجھے اپنے دادا کی شادی کے لیے چھٹی چاہیے۔''
اُستاد نے پوچھا: ''وہ اس عمر میں شادی کیوں کر رہے ہیں؟''
بچے نے کہا: ''سر! وہ تو نہیں کر رہے میں زبردستی کروا رہا ہوں۔''
(عبدالمقیت، فیصل آباد)

☆☆☆

میری زندگی کے مقاصد

یمنیٰ طارق، لاہور
میں ٹیچر بن کر ملک کی خدمت کروں گی۔

فاطمہ نور، اوکاڑہ
میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گی۔

حسیب الرحمٰن، راولپنڈی
میں بڑا ہو کر ایئرفورس میں شامل ہو کر اپنے ملک کا نام روشن کروں گا۔
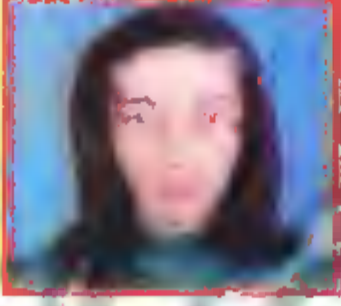
فاکہہ خالد، جوہر آباد
میں اُستانی بن کر غریب بچوں کو مفت تعلیم دینا چاہتی ہوں۔

محمد حسن ذیشان، سانگلہ
میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور لوگوں کی خدمت کروں گا۔

محمد سلمان خالد، جوہر آباد
میں انجینئر بن کر نئی نئی چیزیں بنا کر ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

ابراہیم ظفر علوی، ملتان
میں آٹو موبائل ڈیزائننگ میں پروفیشنل بنا چاہتا ہوں۔

محمد حارث، فیصل آباد
میں بڑا ہو کر انجینئر بنوں گا اور ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

محمد حنظلہ اسلم، لاہور
میں بڑا ہو کر فوجی بنوں گا اور اپنے ملک کی حفاظت کروں گا۔

زینب ابوبکر، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

زہرہ فاطمہ، لاہور
میری زندگی کا مقصد میرے دین کی سرفرازی ہے۔ میں اسی لیے مسلماں میں اسی لیے نمازی

ثانیہ اشفاق، پھول نگر
میں بڑی ہو کر ٹیچر بنوں گی اور تعلیم عام کروں گی۔

اریج ارتیج خان، اسلام آباد
میں بڑی ہو کر لیکچرار بنوں گی اور علم کی روشنی پھیلاؤں گی۔

انس وحید، لاہور
میں بڑا ہو کر کمپیوٹر انجینئر بنوں گا۔

محمد احمد، دنیاپور
میں بڑا ہو کر پاکستان کرکٹ ٹیم کا کھلاڑی بنوں گا۔

منعم خالد، راولپنڈی
میں آرمی میں جا کر اپنے وطن کی حفاظت کروں گا اور اپنے وطن کے لیے اپنی جان قربان کروں گا۔

علی رضا طارق، ٹانڈلیانوالہ
میں بڑا ہو کر آرمی آفیسر بنوں گا ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

طیب انجم، فیصل آباد
میں بڑا ہو کر ایک ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں اور غریبوں کا مفت علاج کرنا چاہتا ہوں۔
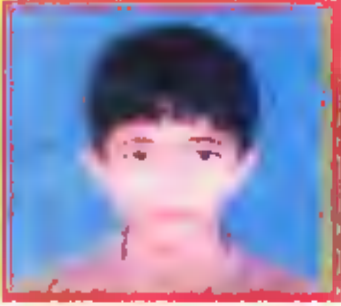
محمد حسن، رسیانہ
میں بڑا ہو کر فوج میں شامل ہوں گا اور پاکستان کی حفاظت کروں گا۔

ارشمیدس

جس نے کرین بنائی

ڈھائی ہزار سال گزرے سسلی کے شہر سیرا گوز پر ایک بادشاہ ہیرو کی حکومت تھی۔ دوسرے بادشاہوں کی طرح ہیرو کو بھی سونے کا خوب صورت تاج پہننے کا شوق تھا۔ بادشاہ نے ایک سنار سے کہا کہ وہ خالص سونے کا ایک تاج بنائے۔ تاج بن کر تیار ہوا تو بادشاہ کو شبہ ہوا کہ سونے میں ملاوٹ کی گئی ہے۔ بادشاہ کو ایسا کوئی طریقہ معلوم نہ تھا جس سے ملاوٹ کا پتا چلتا۔ اس زمانے میں سیرا گوز میں ایک مشہور عالم رہا کرتا تھا جس کا نام ارشمیدس (Archimedese) تھا۔ بادشاہ نے ارشمیدس کو طلب کیا اور پوچھا کہ بتاؤ "سونے میں ملاوٹ کی گئی ہے یا نہیں۔" ارشمیدس کئی روز تک اس مسئلے پر غور کرتا رہا مگر بادشاہ کے سوال کا جواب اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ ایک روز وہ نہانے کے لیے پانی کے ٹب میں بیٹھا۔ ٹب لبالب بھرا ہوا تھا۔ جونہی ارشمیدس ٹب میں اترا بہت سا پانی ٹب سے نکل کر بہہ گیا۔ ارشمیدس فوراً "یوریکا۔ یوریکا" پکارتا ہوا ٹب سے باہر نکل آیا۔ یوریکا یونانی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مطلب ہے "مجھے معلوم ہو گیا۔" ارشمیدس غسل خانے سے نکل کر سیدھا گھر کی طرف بھاگا۔ خوشی کے مارے اسے کپڑے پہننے کا بھی دھیان نہ رہا۔ لوگ حیران تھے کہ ارشمیدس ننگ دھڑنگ کیوں بھاگ رہا ہے۔ کہیں وہ پاگل تو نہیں ہو گیا۔

ارشمیدس نے ٹب سے گرتے ہوئے پانی کو دیکھ کر سائنس کا ایک اصول دریافت کیا تھا۔ وہ اصول یہ تھا کہ جب کوئی چیز پانی میں ڈالی جائے تو اس کے ڈوبنے سے کچھ پانی اپنی جگہ سے ہٹ جاتا ہے۔ جتنا پانی اپنی جگہ سے ہٹتا ہے اس چیز کے وزن میں اتنی ہی کمی ہو جاتی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ بعض دھاتیں ہلکی اور بعض بھاری ہوتی ہیں۔ ارشمیدس نے یہ اندازہ لگایا کہ ہلکی چیز زیادہ جگہ گھیرتی ہے۔ اس لیے وہ زیادہ پانی کو جگہ سے ہٹائے گی۔ اس کا خیال تھا کہ سنار نے سونے میں چاندی کی ملاوٹ کی ہو گی چاندی سونے سے ہلکی ہوتی ہے۔ اگر تاج کو پانی میں رکھا جائے تو اس کے وزن سے جو پانی اپنی جگہ سے ہٹے گا اس کی مدد سے ملاوٹ کا پتا چل جائے گا۔

ارشمیدس حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے 287 سال پہلے سیرا گوز میں پیدا ہوا تھا۔ بچپن ہی سے وہ بہت ذہین تھا۔ اس لیے اس کے باپ نے اسے تعلیم کے لیے مصر بھیج دیا۔ مصر کے شہر اسکندریہ میں اس نے اپنے زمانے کے مشہور عالموں سے ریاضی، جیومیٹری اور دوسرے علوم سیکھے۔ بہت جلد اس نے ریاضی میں بڑی قابلیت پیدا کر لی۔ اس نے ایک مشین تیار کی جس سے دریا اور کنوؤں کا پانی دور دور تک کھیتوں میں آسانی سے پہنچایا جا سکتا تھا۔ ارشمیدس کی اس مشین سے مصر کے کسانوں کو کھیتی باڑی میں بہت آسانی ہو گئی۔ آپ جانتے ہیں کہ پانی اپنی سطح برابر رکھتا ہے۔ بہت سے کھیت جو اونچی جگہ پر تھے وہاں دریا یا کنوئیں کا پانی پہنچانا مشکل تھا۔ ارشمیدس کی مشین سے پانی کو اوپر چڑھایا جا سکتا تھا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ارشمیدس اپنے وطن واپس آ گیا۔ وہاں اس نے اپنے ملک کے لوگوں کی بہت خدمت کی۔ اس نے بہت سی مشینیں بنائیں جن سے بھاری چیزیں آسانی کے ساتھ اُٹھائی جا سکتی تھیں۔ آپ نے کرین کا نام سنا ہو گا۔ یہ مشین سینکڑوں من وزن کو اوپر اُٹھا سکتی ہے۔ ارشمیدس کی مشین اتنا وزن تو نہ اُٹھا سکتی تھی لیکن اس کی مدد سے ایک آدمی کئی من وزن کے پتھر کو آسانی سے اوپر اُٹھا لیتا تھا۔ کرین بھی اسی اصول پر کام کرتی ہے جس اصول پر ارشمیدس کی مشینیں کام کرتی تھیں۔

ایک مرتبہ ارشمیدس نے دعویٰ کیا کہ اگر اسے زمین سے باہر

کھڑا ہونے کے لیے کوئی جگہ دے دی جائے تو وہ لیور کی مدد سے پوری دُنیا کو اوپر اُٹھا سکتا ہے۔ یہ بات پڑھ کر آپ کو ہنسی آ گئی ہو گی بھلا ایک آدمی اتنی بڑی دُنیا کو کیسے اُٹھا سکتا ہے۔ آیئے! آپ کو بتائیں کہ ارشمیدس کے اس وعدے کا مطلب کیا تھا۔ آپ نے مستری کو موٹر کی مرمت کرتے ضرور دیکھا ہو گا۔ جب موٹر کے پہیے میں پنکچر ہو جائے تو پہیہ نکالنے کے لیے موٹر کو تھوڑا سا اوپر اُٹھانا پڑتا ہے جسے ''جیک'' کہتے ہیں۔ اس جیک کا وزن مشکل سے ڈیڑھ دو سیر ہوتا ہو گا۔ اسے موٹر کے نیچے رکھ کر ایک چھوٹے سے ہینڈل کو گھماتے ہیں تو جیک کا ایک سرا اوپر کو اُٹھتا چلا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ موٹر بھی زمین سے اوپر اُٹھ جاتی ہے۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ دو ڈھائی سیر وزن کا ایک اوزار بیس پچیس من وزن کی موٹر کو اوپر اُٹھا لیتا ہے لیکن اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں لیور کی مدد سے آپ بھی کسی بھاری چیز کو آسانی کے ساتھ اُٹھا سکتے ہیں۔

آپ کے گھر میں مسالہ پیسنے کی سل ہو گی۔ یہ ایک بھاری پتھر ہے۔ آپ اسے دونوں ہاتھوں سے بھی نہیں اُٹھا سکیں گے۔ اس سل کے قریب ایک چھوٹا سا پتھر رکھ دیجیے۔ ایک لوہے کی سلاخ لیجیے اور اسے درمیان میں سے پتھر کے اوپر رکھیے۔ ایک سرے کو اپنے ہاتھ میں پکڑیے اور دوسرے سرے کو سل کے نیچے لگائیے۔ اب سلاخ کے دوسرے سرے کو ایک ہاتھ سے نیچے دبایئے۔ آپ کے ہلکے سے اشارے سے سل اوپر اُٹھنا شروع ہو جائے گی۔ اسی سلاخ کو جس کی مدد سے آپ نے اتنی آسانی کے ساتھ بھاری سل کو اوپر اُٹھا دیا، سائنس کی زبان میں ''لیور'' کہتے ہیں۔ اب آپ ارشمیدس کی بات کا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔ ارشمیدس کو ایسی کوئی جگہ نہیں مل سکتی تھی جہاں کھڑے ہو کر وہ لیور کی مدد سے دُنیا کو اوپر اُٹھا دیتا لیکن اس نے لیور کے اصول پر ایسی مشینیں ضرور بنائیں جن کی مدد سے سسلی والوں نے روم کے بڑے بڑے جنگی جہازوں کو تباہ کر دیا۔

ارشمیدس کے ملک سسلی پر روم کی فوجیں برابر حملے کرتی رہتی تھیں۔ سسلی کے بادشاہ کے پاس بہت تھوڑی فوج تھی۔ یہ فوج روم کی فوجوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ ایک مرتبہ بادشاہ نے ارشمیدس سے کہا کہ وہ دشمن کو شکست دینے کی کوئی ترکیب نکالے۔ روم کی فوجیں بڑے بڑے سمندری جہازوں میں سسلی کی طرف آ رہی تھیں۔ ارشمیدس نے لیور لگی ہوئی ایسی مشینیں بنائیں جن کی مدد سے بھاری بھاری پتھر دور تک پھینکے جا سکتے تھے۔ جب روم کے جہاز سسلی کے ساحل کے قریب پہنچے تو ان پر پتھروں کی بارش ہونے لگی اور بہت سے جہاز ڈوب گئے۔ سسلی کے سپاہیوں نے بہت سے رومی جہازوں پر مضبوط موٹے رسوں کے پھندے ڈال کر انہیں ارشمیدس کی بنائی ہوئی کرین سے تیزی کے ساتھ ساحل کی طرف کھینچ لیا۔ یہ جہاز ساحل پر بڑی بڑی چٹانوں سے ٹکرا کر ٹوٹ گئے۔

آپ نے وہ شیشہ دیکھا ہو گا جس میں سے سورج کی روشنی بندھ کر گزرتی ہے۔ یہ روشنی اتنی گرم ہوتی ہے کہ اگر روئی، کاغذ یا کپڑے کا ٹکڑا سامنے رکھا جائے تو اس میں آگ لگ جاتی ہے۔ ارشمیدس نے ایسے کئی بڑے بڑے شیشے ساحل پر لگا دیئے۔ جب رومی جہاز دوبارہ ساحل کے قریب آئے تو ان شیشوں کی مدد سے سورج کا عکس رومی جہازوں پر ڈالا گیا۔ ان کے بادبانوں میں آگ لگ گئی اور بہت سے جہاز جل کر سمندر میں غرق ہو گئے۔

ارشمیدس کی ان مشینوں کی وجہ سے رومی فوجیں کئی سال تک سسلی پر قبضہ نہ کر سکیں۔ ایک مرتبہ ان فوجوں نے سسلی پر زبردست حملہ کیا اور سسلی کی فوجوں کو شکست دے دی۔ رومی فوج کے جرنیل کو معلوم تھا کہ ارشمیدس کی مشینوں ہی کی مدد سے سسلی کی فوجیں کئی سال تک رومی فوجوں کا مقابلہ کرتی رہی ہیں۔ جب رومی فوجیں سیراگوز میں داخل ہو گئیں تو رومی جرنیل نے اپنے سپاہیوں کو ارشمیدس کی تلاش میں بھیجا۔ کہتے ہیں کہ ارشمیدس اپنے مکان میں بیٹھا جیومیٹری کے کسی مسئلے پر غور کر رہا تھا۔ اسے شاید یہ خبر نہ تھی کہ شہر پر رومی فوجوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ رومی سپاہیوں نے اس سے کہا کہ جرنیل نے اسے طلب کیا ہے۔ ارشمیدس نے سپاہیوں کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ سپاہی نے غصے میں آ کر اسے قتل کر دیا۔

ارشمیدس نے زندگی بھر اپنے وطن کی خدمت کی تھی۔ اس نے وطن کے لوگوں کے لیے ایسی مشینیں بنائیں جن کی مدد سے وہ بہت سے مشکل کام آسانی کے ساتھ کر لیتے تھے۔ جب دشمنوں نے وطن پر حملہ کیا تو اس نے اپنے علم کے ذریعے وطن کے سپاہیوں کو دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے جنگی مشینیں بنا کر دیں۔ ارشمیدس کی ان خدمات کی وجہ سے سیراگوز کے لوگ اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ ارشمیدس کے مرنے کے بعد انہوں نے اس کی لاش کو بڑے احترام کے ساتھ دفن کیا اور اس کی قبر پر ایک شان دار مقبرہ تعمیر کیا۔ ارشمیدس نے ریاضی اور سائنس کے جو اصول معلوم کیے تھے بعد میں بہت سے سائنس دانوں نے ان کی مدد سے نئے نئے اصول معلوم کیے۔ اس کی بنائی ہوئی مشینوں میں بھی اصلاحات کی گئیں۔ اس طرح ارشمیدس کے علم اور اس کے تجربات سے دُنیا کے تمام ملکوں کو فائدہ پہنچا۔

ذائقہ کارنر

آلو کے پف — سویٹ اینڈ ساور بیف

آلو کے پف

اشیاء:

مکھن: دو اونس — پانی: آدھا کپ — انڈے: دو عدد

میدہ: آدھا کپ — لال مرچ پاؤڈر: ایک چٹکی — آلو (اُبلے اور ملیدہ شدہ): 3/4 کپ

کنور چکن کیوب: ایک عدد — تیل: تلنے کے لیے

ترکیب: ایک ساس پین میں آدھا کپ پانی ڈال کر گرم کریں اور اس میں مکھن و چکن کیوب ڈال کر چولہے سے ہٹا کر حل کریں۔ کیوب گھل جائے اور مکھن پگھل جائے تو میدہ ملا کر دوبارہ آنچ پر رکھیں اور خوب چمچ سے ہلاتے ہوئے پکائیں حتیٰ کہ مرکب ساس پین کا پیندا چھوڑنے لگے، آنچ بند کر دیں۔ قدرے ٹھنڈا ہونے دیں اور پھر دونوں انڈے توڑ کر ملا دیں۔ ساتھ ہی آلو بھی، اچھی طرح اس مرکب کو مع چٹکی لال مرچ پاؤڈر پھینٹ لیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کریں اور ایک ایک چمچ اس مرکب کا بھر کر ڈالیں اور تل کر گولڈن کر لیں۔ آنچ ہلکی رکھیں، پھر جاذب کاغذ پر نکالیں اور گرم گرم پیش کریں۔ اس ڈش میں آپ کو کنور چکن کیوب کی وجہ سے ایک منفرد اور مزیدار ذائقہ ملے گا جسے آپ بے حد پسند کریں گے۔

سویٹ اینڈ ساور بیف

اشیاء:

گائے کا گوشت بغیر ہڈی کا بہت عمدہ: آدھا کلو — کارن فلور یا کارن اسٹارچ: آدھا کپ — اناس کے چھلکے: ایک چھوٹا ڈبہ

پانی: دو کپ — سرکہ: 3/4 کپ — چینی: 1/2 کپ

نمک: ایک چائے کا چمچ — کنور چکن کیوبز: دو عدد — شملہ مرچ بڑی: دو عدد

ٹماٹر: دو عدد — پیاز (چوکور کٹی ہوئی): دو عدد — انڈے: دو عدد

رفحان کارن آئل: تلنے کے لیے

ترکیب: آدھا انچ موٹائی میں کٹے گوشت کو آدھا انچ کیوبز میں کاٹ لیں۔ ایک جو السن باریک پیس کر انڈوں میں پھینٹ لیں۔ گوشت کو انڈوں کے محلول میں ڈبو ڈبو کر آدھے کارن فلور میں رول کریں۔ تیل گرم کر کے گوشت کے ٹکڑے ڈیپ فرائی کر کے گولڈن براؤن کر لیں۔ ڈبے میں سے اناس نکال لیں۔ جوس میں بقیہ 1/4 کپ کارن اسٹارچ ملا دیں۔ پھر اس جوس میں سرکہ، چینی اور نمک ملا دیں۔ پانی گرم کر کے دونوں کیوبز گھول لیں اور ٹھنڈا کر کے ملا دیں۔ 1/4 کپ تیل گرم کر کے سبزیاں، بیف اور اناس کے ٹکڑے ڈال دیں۔ ساتھ ہی سرکہ چینی والا محلول بھی ڈال دیں۔ دو منٹ پکا کر سب کو گرم ہونے دیں اور پھر چائنیز چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔

بچوں کا انسائیکلو پیڈیا

ڈاکٹر طارق ریاض خان

پاکستانی روپیہ

پاکستان کی کرنسی کا نام روپیہ (Rupee) ہے۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان جو پاکستان کا مرکزی بینک ہے وہ اسے جاری کرنے کا مجاز ہے۔ 1947ء میں پاکستانی روپے کی بجائے برطانوی عہد کے سکے جن پر پاکستان لکھا ہوتا تھا بحیثیت پاکستانی کرنسی استعمال ہوئے۔ تاہم 1948ء میں نئے سکے (Coins) اور روپے (Rupees) متعارف کروائے گئے۔ ایک روپے میں 100 پیسے ہوتے تھے۔ 1994ء میں پیسے ختم کر دیئے گئے۔ اب سب سے چھوٹا ایک اور سب سے بڑا روپیہ 5000 مالیت کا ہے۔ ایک روپیہ سکے کی شکل میں ہے۔ یہ 1998ء میں شروع کیا گیا جس کے ایک طرف بادشاہی مسجد اور دوسری طرف قائداعظمؒ کا عکس یا شبیہہ کندہ ہے۔ 1984ء تک اسٹیٹ بینک نے ایک روپے کے نوٹ بھی جاری کیے لیکن اب صرف سکے کی صورت میں روپیہ استعمال ہوتا ہے۔ 1949ء میں پاکستانی روپیہ نکل (Nickel) کا بنا ہوا تھا۔ پاکستانی روپیہ آج کل دو اور پانچ روپے کے سکے کی صورت میں بھی خرچ کیا جاتا ہے۔ 15 اکتوبر 2015ء کو اسٹیٹ بینک نے سمارٹ سا 5 روپے کا سکہ جاری کیا ہے جس کا وزن 3 گرام ہے۔ یہ نیا سکہ چمک دار ہے جس میں کاپر 79 فی صد، زنک 20 فی صد اور نکل ایک فیصد استعمال ہوا ہے۔

انڈونیشیا کا پرچم

جمہوریہ انڈونیشیا جنوب مشرقی ایشیا میں واقع اسلامی ملک ہے جو بحرِ ہند اور بحرالکاہل کے درمیان جزائر پر مشتمل ریاست ہے۔ یہ دُنیا کے بڑی آبادی والے ممالک میں شامل ہے جس کا دارالحکومت جکارتہ ہے۔ انڈونیشیا کے قومی پرچم کو (Sang Saka Merah Putih) یعنی دورنگی جھنڈا کہا جاتا ہے۔ اس پرچم میں سرخ دھاری انسانی لہو کو جب کہ سفید دھاری انسانی جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ یہ پرچم 17 اگست 1945ء کو قومی دن کے موقع پر متعارف اور لہرایا گیا۔ دیکھنے میں یہ جھنڈا پولینڈ کے جھنڈے سے ملتا ہے۔

فرق یہ ہے کہ پولینڈ کے جھنڈے میں سفید دھاری اوپر ہے اور سرخ دھاری نیچے۔ انڈونیشیا کے پرچم میں سرخ و سفید رنگ کی دھاریاں درحقیقت 13 ویں صدی کے 'Majapahit' عہد کے پرچم کا تسلسل ہے۔ اس شہنشاہ کے دور میں سرخ و سفید دھاریوں والا جھنڈا ریاست کی نمائندگی کرتا تھا۔ اس میں 5 سرخ اور 5 سفید دھاریاں ہوا کرتی تھیں۔ ہالینڈ سے آزادی کے بعد انڈونیشیا کی پارلیمنٹ نے موجودہ پرچم کی منظوری دی۔

موت کی ٹوپی

موت کی ٹوپی یا ڈیتھ کیپ مشروم (Death Cap Mushroom) کا سائنسی نام "Amanita Phalloides" ہے جب کہ اس کا تعلق فنجائی کے گروہ (Basidiomycota) سے ہے۔ یہ نہایت زہریلی کھمبی ہے جو برسات کے دنوں میں عام نظر آتی ہے۔ اس کھمبی کی چھتری سبزی مائل رنگ کی ہوتی ہے جب کہ اندر کے گلز سفید ہوتے ہیں۔ اس کے زہریلے پن کی وجہ اس میں موجود الفا ایمانی ٹن (Amanitin) ہے جو مشروم کھانے والے کے جگر اور گردے فیل کر کے موت کے منہ میں دھکیل دیتا ہے۔ 1740ء میں رومن بادشاہ چارلس چہارم کی موت بھی اس زہریلی مشروم کو کھانے سے ہوئی تھی۔ اس کھمبی کی چھتری (Cap) 5 سے 15 سینٹی میٹر گولائی میں ہوتی ہے۔ اس کا رنگ سبزی مائل، ہلکا پیلا، گہرا سبز، سفید مائل پیلا ہوتا ہے۔ اس میں سے میٹھی بھینی خوشبو نکلتی ہے۔ کیوں کہ یہ دیکھنے میں یہ بھلی محسوس ہوتی ہے، اس لیے مشروم کھانے والے احباب اسے کھانے کی غلطی کر لیتے ہیں۔ اس مشروم کو کھانے سے 6 سے 16 دن بعد تک موت واقع ہو جاتی ہے۔ پکانے سے بھی اس کے زہر کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

کالا نمک

کالا نمک (Black Salt) کو عربی میں "ملح اسود" کہا جاتا ہے جو برصغیر میں مصالحہ جات کے ہمراہ استعمال ہوتا ہے۔ اسے 'ہمالیہ کا نمک' اور 'کالا لون' بھی کہا جاتا ہے۔ کالا نمک کیمیائی طور پر سوڈیم کلورائیڈ، سوڈیم بائی سلفیٹ، سوڈیم بائی سلفائیٹ، آئرن سلفائیڈ اور ہائیڈروجن سلفائیڈ کا بنا ہوتا ہے۔ آئرن کی وجہ سے یہ گہرا جامنی یا سیاہ مائل دکھائی دیتا ہے۔ اس کی مخصوص بو ہائیڈروجن سلفائیڈ کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یہ نمک قدرتی طور پر پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش و نیپال میں پایا جاتا ہے۔ نیپال اور بھارت میں کالا نمک بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ اسے مخصوص عمل سے گزار کر اس کی چبھتی ہوئی بو کو کم کیا جاتا ہے۔ نمک کے کرسٹل سیاہ ہوتے ہیں لیکن پسنے کے بعد یہ گلابی رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ اسی لیے اسے 'Pink Salt' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ نمک چاٹ، دہی بھلے، چٹنی، سلاد، رائتہ اور مختلف ڈشوں میں استعمال ہوتا ہے۔ پاکستان میں کالا نمک کے استعمال کی بجائے سفید چٹانی نمک کا استعمال زیادہ ہے۔
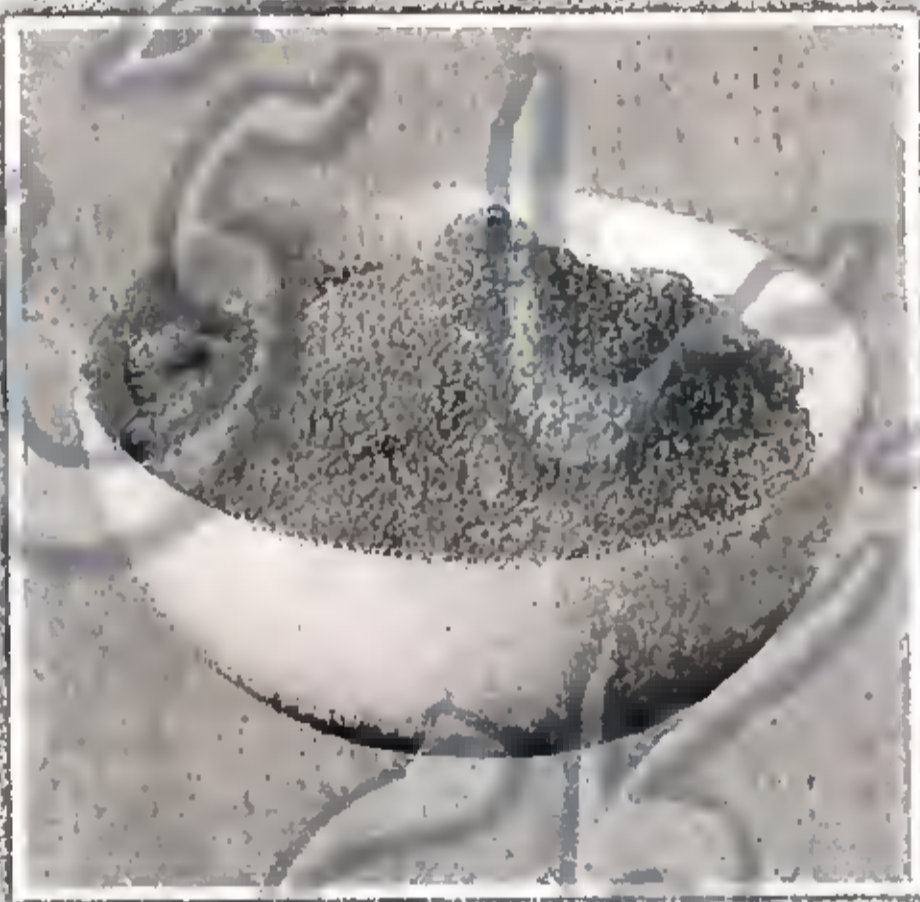
☆☆☆

بوجھو تو جانیں

1- ہم چھوٹے تھے تم بڑے تھے
ہم نے پیار کیا تم رو پڑے

2- ہری ڈنڈی سرخ کمان
توبہ توبہ کرے پٹھان

3- ایک سال کے بعد وہ آئے
دن تاریخ مہینہ بتلائے
(فاطمہ انور، کھوڑ)

4- کبھی چھوٹا، کبھی بڑا، بے سہارا فضا میں کھڑا
دن کو جائے شب کو آئے، بوجھنے والا مجھ کو بتائے

5- لوہے کی کیل انسان کے اندر
بیماری ہو جائے چھو منتر

6- مٹی گارا ان کا کھاجا
دیواروں سے ان کا ساجھا
(اسامہ بن خرم، گوجر خان)

7- بیل پڑی تالاب میں پھول کھلتا جائے
عجب تماشا میں نے دیکھا پھول بیل کو کھائے

8- تاروں کا جال بچھائے
تاروں کا محل بنائے
(مائزہ حنیف، بہاول پور)

9- ایک ماہ کے بعد آئے
بیٹھے بیٹھے گیت سنائے
ہم تم سب کے دل بہلائے
کوئی اس کا نام بتائے
(عائشہ خالد شیخ، مہک خالد شیخ، لاہور)

یادداشت بہتر بنائیں!

اس صفحے کی تصویروں کو غور سے دیکھیے۔
اب آنکھیں بند کر کے گنیے،
آپ کو ان میں سے کتنی تصویریں یاد رہ گئی ہیں۔

WELCOME

ضرب المثل کہانی

زبیدہ سلطانہ
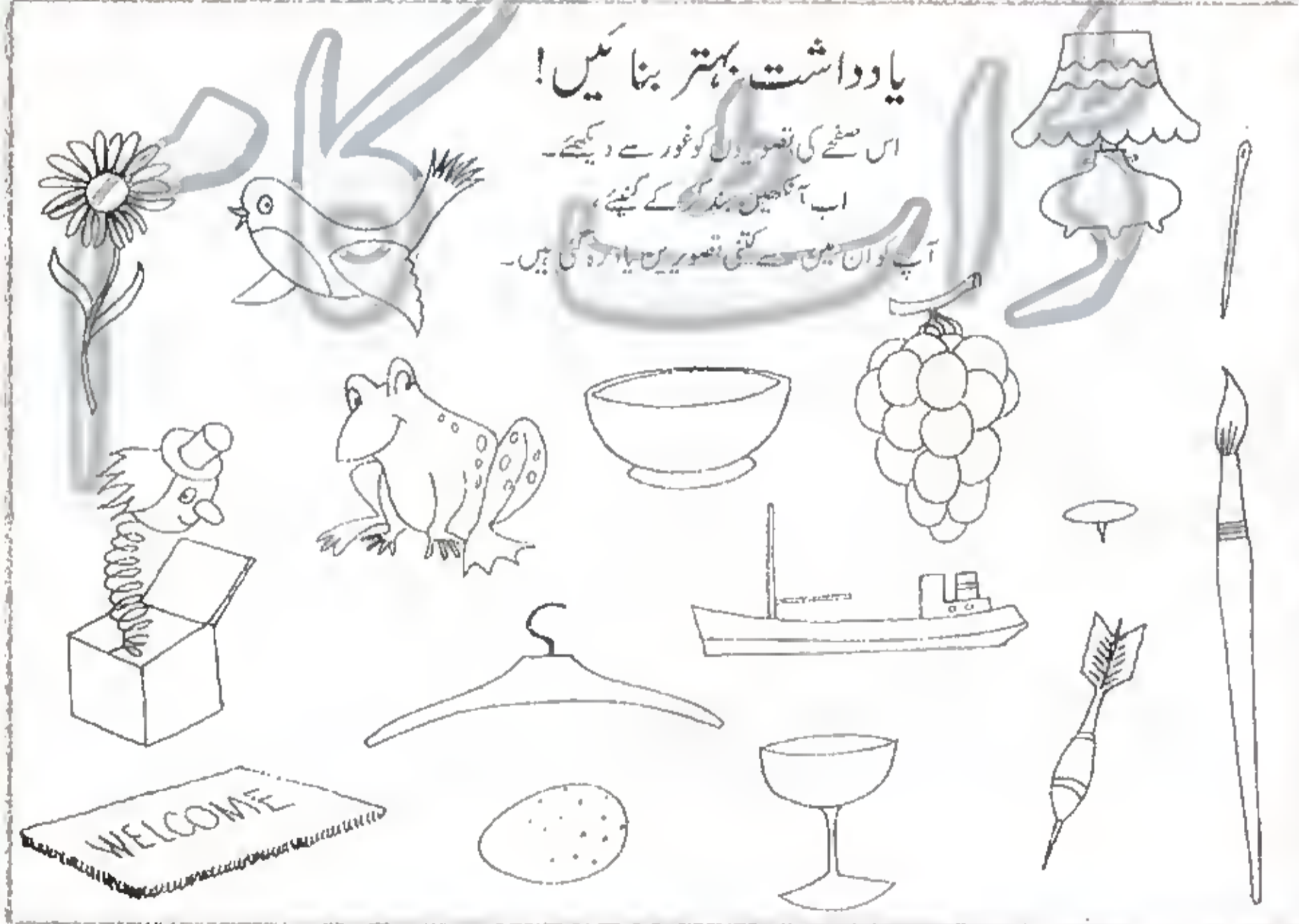
بغل میں لڑکا شہر میں ڈھنڈورا

سونیا اور سونو دونوں بہن بھائی اپنے پالتو کتے کے لیے گھروندا بنا رہے تھے۔ سونو نے بڑے سے لوٹے میں پانی بھرا اور سونیا سے کہا کہ ”لوٹا بھاری ہے، مجھ اکیلے سے اٹھایا نہیں جاتا، ایک طرف سے پکڑو، دونوں مل کر لے چلیں اور اینٹیں جوڑنے کے لیے مٹی گوندھیں۔“ سونیا نے اس کی مدد کی۔ وہ لوٹا اٹھا کر چلے ہی تھے کہ سونو کے ہاتھ سے لوٹا چھوٹ گیا اور سونیا کے پیر کے انگوٹھے پر اس کے تلے کا کنارا کھب گیا۔ چار سال کی ننھی سی جان اس شدید ضرب سے تڑپ اُٹھی۔ اس کے چیخنے چلانے سے گھر کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ دیکھا تو بچی کے پیر سے خون کا فوارہ اُبل رہا تھا۔ ”یہ کیسے ہوا؟“ باپ نے گھبرا کر پوچھا۔ درد سے نیلی پیلی ہوتی ہوئی سونیا کی زبان سے صرف اتنا ہی نکلا: ”بھیا نے......“ اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

ابو اسے اُٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے گئے، پٹی کروا کر واپس لائے تو بچی ہوش میں تھی اور پُرسکون تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا: ”بھیا کہاں ہے؟ ابو نے بھیا کو مارا؟“ اس کے پوچھنے پر سب کو خیال آیا کہ سونو کہیں نظر نہیں آ رہا۔ اب تو سب پریشان ہو گئے۔ گھر میں اور ہر جگہ دیکھا، لڑکا کہیں نہ تھا۔ پھر گلی محلے اور بازار میں سب سے پوچھا کہ کسی نے سونو کو دیکھا ہو۔ ہمسائے اور جاننے پہچاننے والے بھی تلاش میں نکل پڑے۔ ٹی وی، ریڈیو پر گمشدگی کا اعلان کروا دیا۔ پولیس اسٹیشن میں رپورٹ دے دی۔ ماں کو غش پہ غش آ رہے تھے۔ سونیا نے رو رو کر بُرا حال کر لیا تھا۔

اتنے ہی میں کسی کام سے بچوں کی پھپھو ڈرائنگ روم میں گئی تو انہیں دبی دبی سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے لپک کر دروازے کا پٹ ہٹایا تو اس کے پیچھے سونو پڑا سو رہا تھا۔ ڈر کے مارے وہ دروازے کے پیچھے گھس کر چھپ گیا تھا اور وہیں روتے روتے سو گیا تھا اور اب نیند میں سسکیاں بھر رہا تھا۔ پھپھو اسے گود میں اُٹھا کر باہر لائیں تو سب اسے دیکھ کر اور حقیقت معلوم ہونے پر ہنسنے لگے اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ سونو کی دادی اماں شکرانے کے نفل پڑھنے کے لیے وضو کرتے کرتے بولیں: ”سارے شہر میں ڈھنڈورا پیٹ دیا اور لڑکا بغل میں چھپا رہا۔“

چیونٹی جیسا

محمد ندیم اختر

''تم بھی زرے چیونٹی جیسے ہو۔''

پہلی بار اس کا اس لفظ سے واسطہ اس دن پڑا جب وہ ندی پار اس جنگل میں چڑیوں کا شکار کرنے نکلے۔ اس سے پہلے کہ وہ کاشف سے پوچھتا کہ ایسی کیا بات ہوئی کہ ایک ہی لمحے میں میرے جیسا اچھا بھلا انسان چیونٹی جیسا ہو گیا؟ ٹھاہ...... کی آواز نے مجھے اس سمت دیکھنے پر مجبور کر دیا جس سمت کاشف نے ایئر گن سے نشانہ باندھ کر ٹریگر دبا دیا تھا۔ میں نے اس درخت کی جانب دیکھا جس کی شاخ سے مینا زمین کی جانب گری تھی۔ ایئر گن سے نشانہ اس مینا کے لیے موت کا پروانہ بن کر گن سے نکلا تھا جو نکلتے ہی ایک معصوم سے پرندے کی جان لے گیا تھا۔ کاشف اس درخت کی جانب بھاگا۔ اسے بھاگتے دیکھ کر میں بھی اس کے پیچھے لپکا۔ خودرو جھاڑیوں نے جنگل کے اس راستے کو روک دیا تھا۔ جھاڑیوں کی وجہ سے آگے بڑھنا مشکل تھا لیکن کاشف جھاڑیاں پھلانگتا ہوا اس درخت کے نیچے رُک گیا۔ اس کی نظریں اس مینا کو تلاش کر رہی تھیں جو اس کے نشانے سے زمین پر گری تھی لیکن درخت کے نیچے کچھ بھی نہیں تھا۔ میں اتنی دیر میں احتیاط سے جھاڑیاں پھلانگتا ہوا اس کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ جنگل میں ہُو کا عالم تھا۔ اس ہو کے عالم میں ہمارے پیروں کے نیچے آنے والے درختوں کے خشک پتے اس ہولناک سناٹے میں تڑتڑا رہے تھے۔ خشک پتوں کے تڑتڑانے کی آوازیں سناٹے کو کسی سحر زدہ ماحول میں بدل رہی تھیں۔ میں نے بھی کاشف کی نظروں کا تعاقب کیا لیکن وہاں وہ مینا نہیں تھی۔

''مینا کو یہیں ہونا چاہیے تھا۔'' کاشف اپنے شکار کو اس جگہ نہ پا کر افسردہ لہجے میں بولا۔ ''ہو سکتا ہے ایئر گن کے چھرے نے اسے کوئی کاری ضرب نہ لگائی ہو اور وہ گرتے ہی اُڑ گئی ہو۔'' میں نے کاشف کی بات سن کر کہا۔

''یہ دیکھو! جھاڑی پر خون کا قطرہ اس بات کی نشان دہی کر رہا ہے کہ چھرے سے زخمی ہونے والی مینا اس جگہ پر گری لیکن شاید انہیں جھاڑیوں میں کہیں چھپ گئی ہے۔'' کاشف نے اس جھاڑی کی جانب توجہ دلائی جہاں خون کے چند قطرے جھاڑی پر نظر آ رہے تھے اور پھر ہم دونوں ان جھاڑیوں میں مینا کو تلاش کرنے لگے۔ جھاڑیوں میں تلاش کرتے ہوئے ہم نے احتیاط کا دامن تھامے رکھا کیونکہ اس جنگل میں سانپ یا بچھو کا ڈر ہمیشہ رہتا تھا کہ کسی جھاڑی میں کوئی سانپ یا زہریلا کیڑا نہ چھپا بیٹھا ہو۔ چند قدم چل کر ہمیں ایک جھاڑی میں ایک پَر نظر آیا جو شاید اسی مینا کا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا

جیسے مینا اسی جھاڑی میں کہیں آ کر چھپی ہو اور اسی کشاکش میں اس کے پَر کا کوئی حصہ جھاڑی کے کانٹوں میں الجھ کر یہیں پھنس گیا ہو۔ میں نے جھاڑی کے نیچے غور سے دیکھا تو مینا کا زرد رنگ کا ایک پیر نظر آیا۔ ''وہ رہی تمہاری مینا......'' میں نے جوش میں کچھ اس طرح کہا کہ کاشف ایک ہی لمحے میں جھاڑی کی شاخوں کو ایک ہاتھ سے پرے کرتے ہوئے مینا کو پکڑنے کے لیے جیسے جھاڑی کے نیچے گھس گیا ہو۔ وہ شاید کب کی مر چکی تھی کیوں کہ مینا کے گرد ڈھیر ساری چیونٹیوں کو دیکھتے ہی مجھے ایک بار پھر کاشف کی بات یاد آ گئی کہ ''تم بھی نرے چیونٹی جیسے ہو۔'' میں نے کاشف کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس سے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ بے چاری تو بے موت ماری جا چکی ہے، اب اسے اُٹھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' کاشف نے بھی افسوس سے سر ہلایا اور میرے ساتھ قدم ملاتا ہوا ان خود رو جھاڑیوں سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ جب ہم دوبارہ اسی مقام پر پہنچ گئے جہاں کھڑے ہو کر اس نے نشانہ لگایا تھا تو میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا اور اشارہ کیا کہ وہ دیکھو سامنے ایک اور مینا بیٹھی ہے۔ بجائے اس کے کہ کاشف اس مینا کا نشانہ لیتا، اس نے واپس جانے کا اشارہ کیا۔ وہ ابھی تک خاموش تھا۔ اس کا نشانہ تو ٹھیک لگا تھا لیکن شاید اسے اس بات کا افسوس تھا کہ وہ مینا کو اپنے گھر لے جا کر اسے پالنا چاہتا تھا لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی، یا پھر اسے اس بات کا افسوس تھا کہ اس کا مقصد معصوم پرندے کی جان لینا نہیں تھا لیکن اس کے نشانے نے اس معصوم پرندے کی جان لے لی۔ ایسی صورت حال میں ایک بار پھر میرا خیال اسی بات کی طرف گیا کہ اس نے مجھے چیونٹی جیسا کیوں کہا تھا لیکن اس کی افسردہ حالت دیکھ کر میں نے یہ پوچھنے کا ارادہ کسی اور وقت پر رکھ دیا۔

کاشف کو اس کے گھر چھوڑ کر میں اپنی گلی میں داخل ہوا تو سامنے ہی چاچا رئیس آ رہے تھے۔ چاچا رئیس جسے پورا محلہ رئیس کنجوس کے نام سے جانتا تھا۔ اکثر بچے تو اسے مکھی چوس بھی کہہ دیتے تھے۔ وہ نام کا ہی رئیس نہیں بلکہ اس کے آباء و اجداد نے جتنی جائیداد اپنی زندگی میں بنا دی تھی، اس کی سات نسلیں بھی بیٹھ کر کھا سکتی تھیں۔ اس لیے خاندانی طور پر بھی یہ رئیس ہی تھا لیکن پہلی بار دیکھنے والا اسے کوئی غریب ہی سمجھ سکتا تھا۔ چاچا رئیس کو کبھی ڈھنگ کے کپڑے یا جوتے پہنے نہیں دیکھا تھا۔ نہ صرف چاچا رئیس کا یہ حال تھا بلکہ اس کی اولاد بھی چاچا کے نقش قدم پر چلتی تھی۔ بالا اس کا بڑا بیٹا تھا۔ اکثر اسکول میں اس بات پر سزا بھگتا کہ اس کی یونی فارم پُرانی ہونے کی وجہ سے اپنا اصل رنگ کھو چکی تھی جب کہ اسکول میں یونی فارم پر سختی سے کار بند رہنا پڑتا تھا۔ سردیوں میں اس دن بالے کا رو رو کر بُرا حال تھا جب پی ٹی صاحب نے بند جوتے نہ ہونے کی وجہ سخت سردی میں مار مار ادھ موا کر دیا۔ ہاتھ ڈنڈوں کی وجہ سے پہلے سرخ ہوئے پھر نیلے ہونے لگے وہ تو اللہ بخشے ماسٹر خدا بخش کو جنھوں نے آگے بڑھ کر پی ٹی سعید صاحب کی منت کر کے بالے کو مزید مار کھانے سے بچایا۔ بالا تھا کہ روتے روتے اپنے ابا کو کوسے جا رہا تھا۔ میں نے چاچا رئیس کو دیکھتے ہی جلدی سے السلام علیکم کہا اور تیزی سے گھر کی جانب تیز تیز قدم اُٹھانے لگا کہ کہیں چاچا رئیس گلی میں روک کر پی ٹی سعید کے حوالے سے باتیں نہ کرنے لگ جائیں کیوں کہ بالا جب بھی مار کھا کر گھر آیا بجائے اس کے کہ چاچا رئیس اسکول میں جا کر ہیڈ ماسٹر صاحب سے ملیں، وہ بالے کے ہم جماعتوں کو روک کر پی ٹی سعید کی شکایتوں کے ڈھیر لگا دیتے تھے۔ شکایتیں لگاتے تو خیر تھی، وہ تو اچھی خاصی گالیوں سے بھی نوازتے تھے۔

☆☆☆

چھٹی کے دن میں حسب معمول دوستوں کے ساتھ شکار، شام میں کرکٹ اور اب مغرب کی نماز سے کچھ دیر پہلے گھر پہنچا تھا۔ سورج غروب ہوتے ہوئے مغرب میں اپنی سرخی چھوڑ رہا تھا۔ امی جان کھانا بنانے میں مصروف تھیں۔ چھوٹا بھائی شکیل اپنا ہوم ورک کرنے میں مصروف تھا۔ صحن کی جنوبی دیوار کے ساتھ ننھی عبیرہ بیٹھی ایک تنکے سے کسی چیز کو چھیڑے جا رہی تھی۔ میں چار پائی سے اُٹھ کر ننھی عبیرہ کے جانب بڑھا تو اس نے جلدی سے تنکا چھپانے کی کوشش کی کہ شاید میں یہ تنکا اس سے اچک لوں گا۔ ننھی عبیرہ دیوار کے ساتھ نظم و ضبط کے ساتھ ایک قطار میں جاتی چیونٹیوں کو تنکے سے چھیڑ رہی تھی۔ عبیرہ جیسے ہی تنکا کسی چیونٹی کے نزدیک کرتی تو چلتی ہوئی رُک جاتی۔ وہ ننھا سا منہ اُٹھا کر دیکھتی اور پھر رستہ بدل کر اسی قطار میں شامل ہو جاتی تھی۔ اتنی دیر میں مَیں نے دیکھا کہ دو چیونٹیاں چاول کے دانے کا ٹوٹا ہوا ایک حصہ اُٹھائے ہوئے اسی قطار میں رواں دواں تھیں۔ چیونٹیوں کو دیکھ کر مجھے کاشف کی کہی بات ایک بار پھر یاد آ گئی کہ ''تم

بھی نرے چیونٹی جیسے ہو۔'' لیکن اب تو کاشف اپنے گھر تھا، اس لیے سوچا کہ صبح کاشف سے ضرور پوچھوں گا کہ اس نے مجھے چیونٹی جیسا کیوں کہا تھا؟ مغرب کی اذان کے بعد رات کا اندھیرا چھانے لگا۔ ابو جان بھی مسجد سے نماز پڑھ کر گھر پہنچ چکے تھے۔ رات کا کھانا تیار ہو چکا تھا۔ گرمیوں کے موسم میں گھر کے کھلے صحن میں بچھی چار پائیوں پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے میں نے چاچا رئیس اور اس کے بیٹے کا ذکر کیا کہ کل پی ٹی سعید صاحب نے سختی سے تنبیہہ کی تھی کہ اسکول کے تمام طالب علم سوموار کو پی ٹی کے لیے نیا یونی فارم پہن کر آئیں۔ میرا یونی فارم تو آ گیا ہے لیکن ہمیشہ کی طرح بالے کا یونی فارم نہیں ہوگا کیوں کہ اس کا باپ دُنیا کا بڑا کنجوس اور تنگ دل شخص ہے۔ اتنا مال و جائیداد کے باوجود اپنے اوپر خرچ نہیں کرتا۔ ابو جان نے کھانا کھاتے ہوئے سر ہلایا اور کہنے لگے۔ ''بیٹا! کچھ لوگ چیونٹی جیسے ہوتے ہیں، جو مال اکٹھا تو کرتے ہیں لیکن مال کھا نہیں سکتے۔'' ابو جان کی بات سن کر میں ایک بار پھر حیران ہو گیا کہ آج کاشف نے بھی مجھے چیونٹی جیسا کہا تھا اور اب ابو جان چاچا رئیس کو چیونٹی جیسا کہہ رہے تھے۔ کیا مجھ اور چاچا رئیس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یقیناً یہ جملہ میرے لیے کسی دھماکے سے کم نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ میں ابو جان سے کچھ پوچھتا، جلدی سے شکیل بولا۔

''ہاں! ابو جان واقعی، ہم نے آج چیونٹیوں کو اکٹھا کرتے دیکھا ہے، کبھی کھاتے نہیں دیکھا۔''

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کھاتی نہیں ہیں، بلکہ کہتے ہیں کہ چیونٹیوں کی ایک ملکہ ہوتی ہے اور یہ سارا مال اپنے بل میں جمع کرتی ہیں جہاں چیونٹیوں کا سارا خاندان ہی اس مال سے کھاتا ہے۔ ان کی ملکہ چیونٹیوں کے اکٹھے کیے ہوئے مال کا خیال رکھتی ہے۔'' ابو جان نے مزید وضاحت کر دی۔

''آپ کی بات کا مطلب ہے کہ چیونٹیاں بھی کنجوس اور تنگ دل ہوتی ہیں۔'' میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

''نہیں بیٹا! وہ چاچا رئیس جیسے لوگوں سے بہتر ہوتی ہیں کیوں کہ وہ اشرف المخلوقات نہ ہونے کے باوجود سردیوں کے موسم کے لیے ذخیرہ کرتی ہیں اور ضرورت پڑنے پر اسے استعمال میں لاتی ہیں۔'' ابو جان نے میرے سوال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ پھر کہنے لگے۔ ''لیکن چاچا رئیس اور ان جیسے دیگر لوگ جو تنگ دل اور کنجوس ہوتے ہیں ان کے بارے میں قرآن پاک کی سورۃ آل عمران کی آیت 180 میں بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

''جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے کچھ عطا فرمایا، اور پھر وہ بخل کرتے ہیں وہ ہرگز اس خیال میں نہ رہیں یہ عمل ان کے لیے بہتر ہوگا بلکہ یہ ان کے حق میں بہت بُرا ہے۔ جس مال میں وہ بخل کرتے ہیں عنقریب قیامت کے دن اس کا طوق بنا کر ان کے گلے میں ڈالا جائے گا۔'' ابو جان نے ایک آیت کا حوالہ دیا اور کہنے لگے۔ ''بیٹا کبھی اپنے رب کے ناشکرے نہیں ہونا چاہیے۔ اپنی بساط کے مطابق زندگی گزارنی چاہیے۔ ایسے تنگ دل لوگ اس دُنیا اور آخرت میں اجر نہیں پاتے۔

ہم لوگ کھانے سے فارغ ہو چکے تھے لیکن ابھی تک میرے ذہن میں یہ سوال بار بار مجھے پریشان کر رہا تھا کہ میں نے تو کبھی بخل نہیں کیا، میں تو کبھی تنگ دل نہیں رہا، پھر کاشف نے مجھے، چیونٹی جیسا...... کیوں کہا تھا۔ ابو جان کی باتوں سے چیونٹی کی مثال تو سمجھ آ گئی تھی لیکن یہ سمجھ نہیں آئی تھی کہ میں کیسے چیونٹی جیسا ہوں؟ اتنی دیر میں ننھی عبیرہ کو دیکھا وہ کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں میرا گولک تھا۔ اس گولک میں میری جیب خرچی کا کچھ حصہ جمع ہو رہا تھا کیوں کہ بچت کا سبق بھی ایک دن ابو جان نے ہی دیا تھا۔ بچت کسی مشکل وقت میں ہمیشہ کام آتی ہے اور بچت کرنا اچھی عادت ہے۔ بچت کا میں نے کاشف کو بھی بتایا ہوا تھا اور پھر ایک دم میرا خیال پلٹا اور میں نے عبیرہ کے ہاتھ سے گولک لے کر زمین پر پٹخ دی۔ میری جیب خرچ کی بچت اتنی ضرور تھی کہ میں چاچا رئیس کے بیٹے بالے کے لیے نئی یونی فارم خرید سکتا۔ یقیناً کسی مجبور کی مدد کرنے سے آخرت میں گلے کے طوق اور نرا چیونٹی جیسا بننے سے بھی بچ جاؤں گا۔ سوچتے سوچتے رات کافی ہو گئی تھی، خوشی سے نیند نہیں آ رہی تھی لیکن صبح جلدی جاگنا تھا کیوں کہ اسکول جا کر بالے کو پی ٹی سعید کی مار سے جو بچانا تھا۔

☆☆☆

تصحیح

تعلیم و تربیت شمارہ جولائی 2016ء میں محترمہ فاطمہ جناح کے مضمون میں ان کی تاریخ پیدائش سہواً غلط چھپی ہے، درست تاریخ پیدائش 31 جولائی 1893ء ہے۔ مہربانی فرما کر تصحیح کر لیں۔

کھوج لگائیے!

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

سیٹھ مجید صاحب بہت سیدھے سادھے اور امیر انسان تھے۔ ان کا تعلق ایک کاروباری گھرانے سے تھا۔ ان کا کاروباری نیٹ ورک پورے ملک میں پھیلا ہوا تھا۔ اپنی رہائش گاہ پر ان کے ہاں بہت سے نوکر چاکر تھے۔ وہ گھر میں بھی ایک بڑے کمرے کو دفتر کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اس دفتر میں ایک تجوری بھی تھی جس سے وہ بوقتِ ضرورت رقم بھی لے لیا کرتے تھے۔

ایک دن کسی پارٹی کو رقم کی ادائیگی کے سلسلے میں سیٹھ صاحب تجوری سے رقم نکال کر گننے لگے۔ منشی صاحب بھی اسی کمرے کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ رقم گننے کے بعد سیٹھ صاحب نے رقم سامنے میز پر رکھ دی۔ اسی دوران سیٹھ صاحب کو کسی دوست کا فون آیا تو وہ فون سننے میں مصروف ہو گئے۔ منشی صاحب کے دل میں لالچ پیدا ہوا تو انہوں نے سیٹھ صاحب سے نظر بچا کر گنی ہوئی رقم میں سے کچھ رقم نکال لی۔

سیٹھ صاحب نے کال سننے کے بعد دوبارہ رقم گنی تو کم تھی۔ وہ بہت حیران ہوئے۔ منشی سے بحث کرنے لگے۔ منشی نے جواب میں بتایا کہ سیٹھ صاحب رقم اتنی ہی تھی لیکن سیٹھ صاحب کو یقین تھا کہ انہوں نے تجوری سے رقم پوری ہی نکالی تھی۔ سیٹھ صاحب بہت حیران تھے کہ رقم گئی تو گئی کہاں؟ اسی دوران دفتر کا دروازہ کھٹکا۔ سیٹھ صاحب نے منشی کو کہا کہ وہ دروازہ کھولے۔ منشی دروازہ کھولنے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا۔ اسی دوران سیٹھ صاحب نے پتا لگا لیا کہ رقم کس نے نکالی اور کیسے کم ہوئی۔

پیارے بچو! آپ سوچ سمجھ کر بتائیں کہ سیٹھ مجید نے کس طرح منشی کو پیسے نکالنے کا مرتکب قرار دیا۔

پیارے بچو! جولائی 2016ء کے کھوج لگائیے کا جواب یہ ہے: ''تسبیح''

1- مسز محمد اکرم، میانوالی
2- زوہا فضل، لاہور
3- رخبا اطہر ضیاء، لاہور
4- ماریہ شمس، اسلام آباد
5- کشف جاوید، فیصل آباد

محمد حسنات حمید

بھیڑیا! انسان کا دوست بن سکتا ہے؟

بھیڑیا ایک پستانیہ (میمل) ہے جس کا تعلق کتے کے خاندان سے ہے۔ جانوروں میں سب سے زیادہ موذی جانور ہے۔ اس کا شمار کرۂ ارض پر پائے جانے والے قدیم ترین جانوروں میں ہوتا ہے۔ ماہرین حیوانات کہتے ہیں کہ یہ دراصل کتا ہے۔ صحراؤں اور جنگلوں میں رہنے کے باعث قد و قامت کے لحاظ سے بڑا ہو گیا۔

دُنیا کی قدیم ترین لوک کہانیوں میں بھیڑیئے کا ذکر جا بجا موجود ہے اور اسے ہر جگہ مکاری، چال بازی اور درندگی کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان ابتداء ہی سے بھیڑیئے کو اپنا دشمن سمجھتا اور اس سے خوف کھاتا چلا آیا ہے۔ اس کی خون آشامی اور دہشت کے بے شمار قصے ہر زبان میں مل جاتے ہیں۔ اگرچہ اب جدید علم کی رو سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ بھیڑیا اتنا موذی اور خونخوار جانور نہیں جتنا کہ مشہور ہے۔ وہ خود آدمی سے ڈرتا ہے اور اس پر خواہ مخواہ حملہ نہیں کرتا، محض اپنے بچاؤ اور حفاظت کے لیے حملہ کر سکتا ہے۔

بھیڑیا یورپ، امریکا، افریقہ اور انڈونیشیا کے براعظموں میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ براعظم انٹارکٹیکا میں سفید رنگ کا بھیڑیا ملتا ہے۔ ان کی شکل و صورت، رنگ اور قد و قامت میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ دُم سمیت اس کا قد پانچ فٹ سے لے کر سات فٹ تک دیکھا گیا ہے۔ مادہ بھیڑیا نر کے مقابلے میں تھوڑی چھوٹی ہوتی ہے۔ بھیڑیئے کی کھال نرم بالوں سے بھری ہوئی اور کسی قدر سیاہ مائل بھوری ہوتی ہے لیکن اس رنگ کے علاوہ بالکل سیاہ، سرخ، خاکی اور سفید بھیڑیئے بھی ملتے ہیں۔ یہ حیوان طبعی طور پر نہایت نڈر، چالاک اور طاقت ور ہوتا ہے۔ اس کا سر کسی قدر بڑا، سینہ تنگ، ٹانگیں لمبی اور مضبوط ہوتی ہیں۔ بھورے رنگ کا بھیڑیا فطری طور پر نہایت تندخو اور قوی ہوتا ہے۔ وہ اپنے سے دوگنی قوت کے حیوان کو آسانی سے شکار کر لیتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بھیڑیا بارہ سنگھے، ہرن اور گھوڑے کو مار گراتا ہے۔ اس کے دانت لمبے اور نوکیلے ہوتے ہیں جن کی مدد سے یہ اپنے شکار کی بوٹیاں کر ڈالتا ہے۔ بھیڑیا اکیلا باہر نہیں نکلتا بلکہ دس دس پندرہ پندرہ کے گروہ کی شکل میں شکار کو نکلتے ہیں اور پھر یہ کسی بڑے جانور کا تعاقب کرتے ہیں۔ شکار کا تعاقب کرتے وقت بھیڑیوں کی رفتار دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ زبان باہر نکالے پوری قوت سے دوڑتے ہیں اور جب شکار نڈھال ہو کر گر نہیں پڑتا، اس وقت تک اس کا پیچھا نہیں

چھوڑتے۔ یہ بات صحیح ہے کہ بھیڑیے آپس میں بھی ایک دوسرے کو ہڑپ کر جاتے ہیں لیکن یہ حادثہ صرف اس صورت میں پیش آتا ہے کہ انہیں تلاش کے باوجود غذا نہ ملے یا بارش اور برف باری کے باعث وہ کسی غار میں قید ہو جائیں۔ تب وہ بھوک سے تنگ آ کر ایک دوسرے پر حملہ کر دیتے ہیں۔ چناں چہ کمزور بھیڑیوں کو طاقت ور بھیڑیے کھا جاتے ہیں۔

بھیڑیا تین چار سال کی عمر میں بالغ ہو جاتا ہے اور جب نر بھیڑیا ایک مادہ کو پسند کر لے تو تمام زندگی اس کے ساتھ بسر کرتا ہے اور کسی دوسرے بھیڑیے کو اس کے نزدیک نہیں آنے دیتا۔ دسمبر اور اپریل کے درمیانی عرصے میں مادہ بھیڑیا بچے دیتی ہے۔ بچوں کی تعداد ایک وقت میں چار سے چودہ تک ہوتی ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ خاندان میں شریک تمام بھیڑیے ان ننھے منے بچوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

شکاریوں کے تجربات و مشاہدات کے مطابق بھیڑیے وسیع و عریض علاقے میں گھومنے کے عادی ہوتے ہیں۔ وہ دن میں تقریباً 80 کلو میٹر کا چکر آسانی سے لگا لیتے ہیں۔ جن راستوں سے وہ ایک بار گزر جائیں انہیں کبھی نہیں بھولتے۔ عموماً وہ اپنے بھٹوں سے رات کے وقت نکلتے ہیں اور چاندنی راتوں میں اکثر ان کے گروہ ساری ساری رات پھرتے رہتے ہیں۔

ماہرین حیوانیات کہتے ہیں کہ بھیڑیے کی نسل اب روز بروز کم ہو رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انسان کو اپنی ضروریات کے لیے زیادہ سے زیادہ زمین درکار ہے۔ اس لیے وہ بیابانوں اور جنگلوں کو لہلہاتی فصلوں میں تبدیل کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ مویشیوں اور بھیڑوں کی حفاظت کا مسئلہ بھی اس کے سامنے ہے اور ان جانوروں کا بھیڑیا جانی دشمن ہے۔ چناں چہ امریکہ میں بھیڑیوں کے خلاف زبردست مہم چلائی گئی اور ہزارہا بھیڑیے نیست و نابود کر دیئے گئے۔ یہی سلوک روس میں بھیڑیوں کے ساتھ کیا گیا۔ پھر بعض ممالک میں بھیڑیوں کی کھالیں بیچنے کا نفع بخش کاروبار چلانے کے لیے ان کو بے دریغ ہلاک کیا جانے لگا۔ اس کے باوجود اب بھی امریکہ اور کینیڈا میں دُنیا میں سب سے زیادہ بھیڑیے پائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد جرمنی و سپین، مشرقی یورپ اور روس میں ہیں۔ ان ملکوں میں پائے جانے والے بھیڑیے ان بھیڑیوں کی نسل میں سے ہیں جو کسی زمانے میں برطانیہ میں گھوما کرتے تھے لیکن سولہویں صدی عیسوی میں انگریزوں نے اپنے ملک سے ان کا صفایا کر دیا اور پھر یہاں سے بھیڑیے دوسرے ملکوں کی طرف بھاگ جانے پر مجبور ہو گئے۔ البتہ اسکاٹ لینڈ میں بھیڑیے اٹھارویں صدی عیسوی کے درمیانی عرصے تک موجود تھے لیکن اب وہاں ڈھونڈنے سے بھی بھیڑیا نہیں ملتا۔ البتہ چڑیا گھروں میں موجود ہے۔ آئرلینڈ والوں نے حتی الامکان بھیڑیوں کی حفاظت کی مگر جب وزیراعظم کرامویل نے اعلان کیا کہ جو شخص مادہ بھیڑیے کو ہلاک کرے گا اسے چھ پونڈ انعام دیئے جائیں گے۔ اس کے بعد لوگوں نے بھیڑیوں کا دنوں کے اندر اندر صفایا پھیر دیا۔

جنگلی خرگوشوں اور گلہریوں کو پکڑنے میں بھیڑیا بڑا ماہر ہے۔ وہ دبے پاؤں بالکل بلی کی طرح جاتا ہے اور گھات لگا کر بیٹھ جاتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ شکار نزدیک آ گیا ہے تو بجلی کی مانند اس پر جا پہنچتا ہے اور منہ میں دبا لیتا ہے۔ اس موقعے پر اس کی آنکھوں میں فتح مندانہ چمک دکھائی دیتی ہے اور پھر وہ آہستہ آہستہ دُم بھی ہلاتا رہتا ہے۔

اگرچہ وہ کتوں سے گھلنا ملنا چاہتا ہے مگر کتے اس سے خائف رہتے ہیں۔ شاید وہ جانتے ہیں کہ یہ جانور ہے تو ہماری ہی برادری کا مگر اس کا ”منصب“ ذرا اونچا ہے۔ اس لیے وہ بے چارے ایک قسم کے احساس کمتری میں مبتلا رہتے ہیں۔

بھیڑیے اور انسان میں کبھی دوستی نہیں ہوئی حالاں کہ کتا جو بھیڑیے کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے، انسان کا نہایت وفادار دوست ہے۔ تاہم پُرانے زمانے کے قصے کہانیوں سے پتا چلتا ہے کہ جنگل یا غاروں میں رہنے والے آدمی بھیڑیے کے بچوں کو پکڑ کر لے آتے تھے اور انہیں سدھا کر اپنے ساتھ رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود بھیڑیے انہیں نقصان پہنچاتے تھے۔ ان کے بچوں کو ہڑپ کر جاتے اور پھر جنگل میں بھاگ جاتے تھے۔ دراصل اس حیوان کا خمیر ہی مکاری، چالاکی اور خون آشامی سے اُٹھایا گیا ہے۔ وہ انسان تو درکنار جنگل کے دوسرے جانوروں حتیٰ کہ خود اپنی ہی جنس کا کبھی دوست نہیں رہا۔

امریکہ کے ایک شخص کا قصہ پڑھیے۔ اس نے گھر میں بہت

سے کتے پالے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ بکریاں، بھیڑیں، گھوڑے، گائیں، بھینسیں، مرغیاں اور بطخیں، خرگوش سبھی جانور تھے۔ بینسین کا گھر اچھا خاصا چڑیا گھر بنا ہوا تھا۔ جدھر دیکھیے جانور اور ان کے بچے کھیلتے کودتے، اچھلتے پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ ایک مرتبہ بینسین نے ایک شکاری کے پاس بھیڑیے کا بچہ دیکھا جسے وہ جنگل سے اٹھا لایا تھا۔ بھیڑیے کا بچہ دیکھتے ہی بینسین نے سوچا کہ اس بھیڑیے کے بچے کو پالنا چاہیے وہ یہ بچہ اپنے گھر لے آیا اس کا نام اس نے کیپا رکھا۔ کیپا کی عمر اس وقت صرف دو ہفتے کی تھی اور وہ محض کتے کا ایک معمولی سا پلا دکھائی دیتا تھا۔

بینسین نے کیپا کو سدھانا شروع کیا اور ایک سال کی محنت کے بعد اتنی کامیابی حاصل کر لی کہ کیپا ایک وفادار کتے کی مانند اس کا اور اس کے گھر والوں کا دوست بن گیا۔ وہ بینسین کے بچوں اور دوسرے جانوروں سے خوب کھیلتا اور گھر کی نگرانی کے فرائض بھی سرانجام دیتا۔ مزید ایک سال کے بعد وہ پورا قد آور بھیڑیا بن چکا تھا۔ لوگ اسے دور سے دیکھتے اور خوف زدہ ہو جاتے۔ کوئی نزدیک آنے کی جرأت نہ کرتا حالاں کہ کیپا نے کبھی کسی انسان یا جانور پر حملہ نہیں کیا تھا۔

بینسین کا مقصد صرف یہی نہیں تھا کہ ایک بھیڑیے کو سدھائے بلکہ وہ چاہتا تھا کہ پوری ایک نسل ایسی پیدا کی جائے جو ''خونخوار'' نہ ہو اور جس پر اعتماد کیا جا سکے لیکن اس کے لیے اسے بہت انتظار کرنا پڑا۔ کیپا کی پرورش کے دوران میں بینسین کو کئی دل چسپ باتیں بھیڑیے کی فطرت کے بارے میں معلوم ہوئیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ کتوں کی طرح اپنے مالک کے سامنے دُم کبھی نہیں ہلاتا۔ اس کے علاوہ شکی اور الگ تھلگ رہنے والا حیوان ہے۔ اجنبیوں سے فوراً گھلنے ملنے کی کوشش نہیں کرتا اور بینسین کے الفاظ میں بھیڑیا فطری طور پر شدید النفس حیوان ہرگز نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے ہم جنس بھیڑیوں کے ساتھ کبھی نہیں لڑے گا اور نہ ان کا تعاقب کرے گا۔ یہ بات صرف کتوں میں پائی جاتی ہے کہ جہاں دو اجنبی کتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو لگے غرانے اور بھونکنے۔ بھیڑیا اپنے اردگرد کی چیزوں کو ایک بار دیکھنے کے بعد کبھی نہیں بھولتا۔ اس کی قوت یادداشت حیرت انگیز ہے۔ وہ آدمیوں، بچوں اور عورتوں کی شکلیں خوب پہچان لیتا ہے۔ حالاں کہ بچے ایک ہی شکل و صورت کے ہوتے ہیں۔

ایک ایسے شخص نے جو پولینڈ اور روس میں پائے جانے والے بھیڑیوں کی فطرت کا مطالعہ کر چکا تھا، بتایا کہ برفانی علاقوں میں جب کہ بہت سے لوگ پھسلنے والے تختوں پر سفر کرتے ہیں، ان کے بارے میں کبھی نہیں سنا گیا کہ بھیڑیوں نے ان پر حملہ کیا ہو۔ البتہ یہ دیکھا گیا ہے کہ دس دس بیس بیس بھیڑیوں کے گروہ انسانوں کا تعاقب ضرور کرتے ہیں لیکن انہیں ہلاک کرنے کی نیت سے نہیں بلکہ محض اس لالچ میں کہ جب یہ مسافر یہاں سے قیام کر کے روانہ ہوں تو پیچھے بچی کھچی خوراک ان کو مل جائے گی۔

بینسین کے کہنے کے مطابق بھیڑیا کتے کی نسبت کہیں زیادہ ہوشیار اور وفادار ثابت ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس کی پرورش اور تربیت ڈھنگ سے کی جائے۔ اپنے تیز حافظے کی مدد سے وہ بہت جلد نئی نئی باتیں سیکھ لیتا ہے اور بار بار ان پر عمل کرتا ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق اس کی عجیب و غریب اور پُراسرار یادداشت نے اسے بہت فائدہ پہنچایا۔

تو ساتھیو! کیوں نہ ہم بھی بھیڑیے کا بچہ پال لیں۔ ☆☆

(بقیہ: چکوال: پیارے وطن کے پیارے شہر)

شفاف ہے، سیاح بوتلوں میں بھر کر بطور سوغات لے جاتے ہیں۔

موجودہ پولیس ریسٹ ہاؤس کے ساتھ ہی ''تختِ بابری'' ہے جو باغ کے وسط میں ہے۔ اسے بابر کی فوج نے ایک بڑی پہاڑی چٹان کو تراش کر بنایا تھا اور بابر نے اس پر کھڑے ہو کر اپنے سپاہیوں سے خطاب کیا تھا۔ تخت پر چڑھنے کے لیے سیڑھیاں ہیں۔ تخت پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو پہاڑیوں کے اندر گھری ہوئی ایک بڑی جھیل ہے۔ جھیل میں سیاحوں کی تفریح کے لیے کشتیاں موجود ہیں۔ یہاں ایک صوفی بزرگ حضرت سلطان باہوؒ بھی تشریف لائے تھے۔ آپؒ نے جہاں قیام فرمایا تھا وہاں ایک چشمہ جاری ہے اور کلر کہار کی آبادی کو اسی چشمے کا پانی پائپوں کے ذریعے فراہم کیا جاتا ہے۔

آبادی کے لحاظ سے کلر کہار ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس میں خوب صورت ہوٹل، فوجی فاؤنڈیشن کا قائم کردہ اسپتال، بنیادی مرکز صحت، ضلع کونسل، ایئرفورس اور محکمہ جنگلات کے ریسٹ ہاؤس ہیں۔ طلباء و طالبات کے لیے ہائی اسکول، تھانہ، ٹیلی فون، ٹرانسپورٹ وغیرہ کی عام سہولتیں دستیاب ہیں۔ ☆

جشنِ آزادی

آؤ بچو سارے آؤ
آزادی کے گیت سناؤ

کتنے لوگوں کی قربانی
دے کر کی حاصل آزادی

اب اس کو محفوظ بناؤ
آزادی کے گیت سناؤ

اس کے کھیتوں کی ہریالی
دل کو اچھی لگنے والی

تم بھی اس سے لطف اُٹھاؤ
آزادی کے گیت سناؤ

جو اسلام کا ہے گہوارہ
پاکستان ہے دیس ہمارا

پیارے دیس کے نغمے گاؤ
آزادی کے گیت سناؤ

بچو تم ہو دولت اس کی
بچو تم ہو عزت اس کی

مل کر یہ گلشن مہکاؤ
آزادی کے گیت سناؤ

ان شاء اللہ شاد رہے گا
دیس اپنا آباد رہے گا

سارے مل کر ہاتھ اُٹھاؤ
آزادی کے گیت سناؤ

ریاض حسین قمر

مختصر مختصر

قیمتی نصیحت

ایک مرتبہ ہارون الرشید نے ایک بزرگ سے کہا۔ ”مجھے نصیحت کریں۔“ انہوں نے کہا کہ اگر آپ کا کوئی مصاحب (درباری) ایسا ہے جو آپ کو خوف دلاتا رہے اور اس کا نتیجہ بہتر ہو تو وہ اس مصاحب سے اچھا ہے جو آپ کو خوف سے آزاد کر دے اور نتیجہ اس کا بُرا ہو۔ ہارون الرشید نے کہا۔ ”ذرا کھول کر بیان فرمائیے تاکہ اچھی طرح بات سمجھ میں آ جائے۔“ انہوں نے کہا کہ اگر کوئی شخص آپ سے یہ کہے کہ قیامت کے دن آپ سے آپ کی رعایا کے متعلق سوال ہونے والا ہے، آپ خدا سے ڈرتے رہے تو وہ اس شخص سے بہتر ہے جو یہ کہے کہ آپ اہل بیت نبویؐ سے ہیں اور بوجہ قرابت نبویؐ کے تمام گناہ معاف ہو چکے ہیں۔ یہ سن کر ہارون الرشید اتنا رویا کہ پاس بیٹھنے والوں کو اس پر ترس آنے لگا۔ (مراسلہ: ثروت یعقوب، لاہور)

ادبی دریچے

ایک تقریب میں فوجی حکمران جنرل ضیاء الحق کی فرمائش پر مزاح کے شاعر ضمیر جعفری نے چند اشعار سنائے۔ سبھی نے تعریف کی۔ وہاں حفیظ جالندھری بھی تھے۔ انہوں نے ضمیر جعفری سے کہا۔ ”میاں ضمیر! جب تم میری ماتحتی میں کام کرتے تھے، اس وقت اتنے اچھے شعر نہیں کہتے تھے۔“ ”جی ہاں!“ ضمیر جعفری نے مسکرا کر کہا۔ ”یہ سب آپ سے دُوری کا فیض ہے۔“ (فائزہ رزاق، خانیوال)

عظیم لوگ عظیم باتیں

☆ عقل مند کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا جب کہ بے وقوف کہتا ہے کہ میں سب جانتا ہوں۔ (حضرت عثمان غنیؓ)

☆ صادق وہ ہے کہ جب اس کو دیکھو تو ویسا ہی پاؤ جیسا کہ سنا تھا۔ (حضرت جنید بغدادیؒ)

☆ بانٹنے سے خوشیاں اس طرح بڑھتی ہیں، جس طرح زمین میں بویا ہوا بیج پوری فصل بن جاتا ہے۔ (حضرت سلمان فارسیؓ)

☆ اصل قابل تعریف شخص وہ ہے جس کی تعریف رشتے دار، ہمسائے اور دوست کریں۔ (حضرت شیخ سعدیؒ)

☆ خوش کلامی ایک ایسا پھول ہے جو کبھی نہیں مرجھاتا۔
(حضرت فرید الدین گنج شکرؒ) (محمد حمزہ سعید، بورے والا)

عمل سے زندگی بنتی ہے

☆ دُنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی دینی تعلیم بھی حاصل کرو۔

☆ اپنا ظاہر و باطن کا آئینہ ایک رکھو اور وہ بھی صاف شفاف۔

☆ زندگی جو ہمیں ملی ہے اس کی قدر کرو ہر لمحہ قیمتی جانو۔

☆ بڑوں اور چھوٹوں سے حسنِ اخلاق سے پیش آؤ۔

☆ زندگی کے آسان یا مشکل وقت میں صرف اللہ کو یاد کرو۔

☆ تفریح کرنے نکلو تو عبرت حاصل کرنے کے لیے۔

☆ اپنی غلطی پر خود کو ملامت کرو، دوسروں کی تنقید سے بچ جاؤ گے۔

☆ دوست ایسے بناؤ جو کام یابی میں ایک دوسرے کو گامزن کرے اور جہالت سے نکالے یا دُور رکھے۔ (مہک خالد شیخ، لاہور)

اقوال زریں

☆ اللہ کے نزدیک تمہاری صورت کی نہیں بلکہ تمہاری سیرت اور اعمال کی ضرورت ہے۔

☆ دیانت داری نیکی کی کنجی ہے اور نیکی جنت کی کنجی ہے۔

☆ عمل کا حسن یہ ہے کہ آج کا کام کل پر مت ڈالو۔

☆ اندھیرے کا گلہ کرنے سے ایک شمع جلانا بہتر ہے۔

☆ مصیبت انسان کو ایسے نکھارتی ہے جیسے آگ سونے کو۔

☆ دُنیا کا مال زندگی کے آرام اور سکون کے لیے ہے نہ کہ زندگی مال جمع کرنے کے لیے۔

☆ اگر تو دُنیا کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے تو لوگوں پر احسان کر جیسے اللہ نے تجھ پر کیا۔

☆ دشمن کے سامنے بے موقع نرمی کرنا اس کو شیر بنانا ہے۔

☆ وہ دشمن جو بظاہر دوست ہو اس کے دانتوں کا زخم زیادہ گہرا ہوتا ہے۔

سنہری اقوال

☆ جن لوگوں کے خیالات اچھے ہوتے ہیں۔ وہ کبھی تنہا نہیں ہوتے جو لوگ خودغرض ہوتے ہیں وہ کبھی اچھے دوست نہیں

بن سکتے۔

☆ ہمیشہ مسکراؤ کیوں کہ دُنیا مسکرانے والوں کا ساتھ دیتی ہے جو اپنے خلوص کی قسمیں کھائے اس پر اعتبار مت کرو۔

☆ محبت سب سے کرو لیکن اعتبار چند ایک پر کرو۔ ہمیشہ سچ بولو قسمیں کھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

☆ فضول بحث بہترین دوست سے جدا کر دیتی ہے۔

☆ لمبی دوستی کے لیے دو چیزوں پر عمل کرو:

ا۔اپنے دوست سے غصے میں بات مت کرو۔

۲۔اپنے دوست کی غصے میں کہی ہوئی بات دل پر مت لو۔

☆ جب کسی کے لیے دل میں نفرت پیدا ہونے لگے تو فوراً اس کی اچھائیاں یاد کیا کرو۔ ☆

تین اصول

زندگی کے تین اصول ہمیشہ یاد رکھو۔

☆ اس سے ضرور معافی مانگو جسے تم چاہتے ہو۔

☆ اسے مت چھوڑو جو تمہیں چاہتا ہے۔

☆ اس سے کچھ نہ چھپاؤ، جو تم پر اعتبار کرے۔

(اسد اللہ ممتاز حسین، فیصل آباد)

اقوال شیخ سعدیؒ

☆ علم تو جتنا بھی حاصل کر اگر تجھ میں عمل نہیں تو پھر تُو جاہل ہی ہے۔

☆ کسی کا دل نہ دکھاؤ تمہارے سینے میں بھی ایک دل ہے۔

☆ قسمت پر راضی ہو جاؤ، غنی ہو جاؤ گے۔

☆ بھوک نور ہے اور پیٹ بھر کر کھانا آگ۔

☆ دن رات میں صرف ایک بار کھانا صدیقوں کا شیوہ ہے۔

☆ بہت کھانا اور بہت سونا دل کو کالا کر دیتا ہے۔

☆ اچھا دوست اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا بہترین تحفہ ہے۔

☆ سونا کان سے کان کنی کے بعد نکلتا ہے اور بخیل کے ہاتھ سے جان کنی کے بعد۔

(ثمرہ احمد سعید بٹ، سیالکوٹ)

پاکستانی پرچم

11 اگست 1947ء کو لیاقت علی خان جو اس وقت مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے، نے اسمبلی میں نمونے کے طور پر پاکستان کے دو عدد جھنڈے قائداعظم محمد علی جناحؒ کے روبرو منظوری کے لیے پیش کیے۔ قائداعظمؒ اس اسمبلی کی صدارت فرما رہے تھے۔ قومی جھنڈے سے متعلق اپنی افتتاحی تقریر میں نواب زادہ لیاقت علی خان نے کہا کہ ''یہ پرچم محض کپڑے کا ایک ٹکڑا ہی نہیں بلکہ یہ پرچم آزادی، امن اور سلامتی کا نشان ہے جو نہ صرف پاکستانی قوم کی نمائندگی کرتا ہے بلکہ بین الاقوامی امن کا نشان ہے۔ یہ جھنڈا کسی ایک سیاسی پارٹی یا قومیت کے لیے نہیں بلکہ پاکستانی قوم اور اس ملک کا عظیم نشان ہے جو 15 اگست، 1947ء کو دُنیا کے نقشے پر اُبھرنے والا ہے۔'' انہوں نے جھنڈے کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے مزید فرمایا کہ ''کپڑا اپنی جگہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ اہمیت اس بات کی ہے جس کی یہ غمازی کرتا ہے۔''

انہوں نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ''میں بغیر کسی شک وشبہ کے یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ جھنڈا ان سب شہریوں کی آزادی، تحفظ اور مساوات کی ترجمانی کرتا ہے جو اس کی اطاعت کریں گے۔'' انہوں نے کہا کہ ''یہ جھنڈا ہر شہری کے جائز اور بنیادی حقوق اور ملک کی سالمیت کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔'' انہوں نے اُمید ظاہر کی کہ ''اس جھنڈے کی ساری اقوام عالم تعظیم کریں گی۔ جب پاکستان قائم ہو گیا اور ہمیں کروڑوں مسلم عوام کے لیے کام کرنے کا موقع ملا تو ہم دنیا میں یہ ثابت کر دیں گے کہ اگرچہ ہمارا ملک نوزائیدہ ہے لیکن ہم پاکستان کو کروڑوں مسلم عوام کا صحیح نمائندہ ثابت کر دکھائیں گے۔ ہم امن اور آشتی سے رہیں گے اور ہمارا ملک عالمی امن کا پرچار کرتا رہے گا۔''

خان لیاقت علی خان نے کہا کہ ''ہم استحصال کے نتائج جانتے ہیں۔ گزشتہ دو برس سے ہمارا استحصال کیا جاتا رہا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کے خلاف صف آراء کیا جاتا رہا ہے لیکن ہم اس جھنڈے کو دوسری اقوام کے خلاف کسی بھی قسم کے استحصال کے لیے کبھی استعمال نہیں کریں گے۔'' لیاقت علی خان نے مختلف طبقات کی ناجائز مراعات کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''پاکستان میں کسی خاص فرد یا طبقے کو خاص قسم کی مراعات یا حقوق نہیں دیئے جائیں گے۔ یہ ملک اور اس کا قومی نشان (جھنڈا) تمام شہریوں کے برابر کے حقوق، مراعات اور مواقع کا ترجمان ہو گا اور ہر شہری اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو گا جو اس پر ملک کی طرف سے عائد ہو گا۔''

(انور کامران، لاہور)

اے حمید

قسط نمبر 7

چاندنی رات میں سانپ

لاش کی طاقت

شہر کے گرد ایک چار دیواری تھی جس کے ساتھ دروازے تھے۔ ان دروازوں پر ہر وقت پہرہ لگا رہتا تھا تاکہ شہر میں فساد کرنے والے لوگ داخل نہ ہوں۔ عام لوگوں کو ہر وقت آنے جانے کی اجازت تھی۔ صرف رات کو شہر میں داخل ہونے والوں سے پوچھ گچھ کی جاتی تھی۔ شہر کے باہر ریت کے ٹیلے تھے۔ ان ٹیلوں میں کھیت بھی تھے اور جہاں پانی کے چشمے تھے وہاں کھجوروں، سنگتروں اور انگوروں کے باغ بھی تھے۔

تھیوسانگ اور کیٹی نے شہر کے اندر کسی سرائے میں ٹھہرنے کی بجائے شہر کے باہر والی ایک سرائے میں ٹھہرنے کا فیصلہ کر لیا اور وہاں دو کوٹھڑیاں کرائے پر لے لیں۔ اب انہوں نے سب سے پہلے بابل شہر میں جا کر جولی سانگ کی تلاش شروع کر دی۔ دن بھر وہ جگہ جگہ جولی سانگ کا سراغ لگاتے رہے مگر انہیں جولی سانگ اور پانڈو نجوی کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ حقیقت یہ تھی کہ جولی سانگ اور پانڈو اسی بابل شہر میں تھے مگر انہوں نے شہر سے شمال کی جانب سات میل کے فاصلے پر دریائے دجلہ کے کنارے کھجوروں کے ایک باغ میں شاندار محل خرید لیا تھا اور وہیں رہنے لگے تھے۔ نجومی پانڈو نے خزانے کے صندوق کو اپنے محل کی پچھلی کوٹھڑی کا فرش کھود کر زمین میں دبا دیا تھا۔ صرف کچھ ہیرے جواہرات بیچ کر اس نے محل خریدا تھا اور باقی جواہرات بیچ کر سونے کے سکے حاصل کر کے انہیں ایک کوٹھڑی میں مرتبانوں میں بھر کر رکھ لیا تھا۔ پانڈو نجوی کے پاس اتنی دولت آ گئی تھی کہ اب اسے کسی شے کی اور کام کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بس وہ سارا دن محل میں بستر پر پڑا آرام کرتا اور جولی سانگ نوکروں سے طرح طرح کے کھانے پکواتی رہتی تھی۔ یہ دونوں بابل شہر میں بھی آتے تھے۔ پانڈو نجوی نے ایک کشتی بھی خرید لی تھی جس میں بیٹھ کر وہ اور جولی سانگ شام کے وقت دریا کی سیر کرتے تھے۔

جب تھیوسانگ اور کیٹی نے شہر کو اچھی طرح چھان مارا اور انہیں عنبر ناگ ماریا اور جولی سانگ کا کوئی سراغ نہ مل سکا تو تھیوسانگ کہنے لگا۔ ''کیوں نہ اب تم ایراوتی کی مورتی والے مینار میں جا کر اس سے ملاقات کرو۔ شاید وہ ہمیں کوئی طاقت عطا کر دے۔''

کیٹی کا دل نہیں چاہتا تھا کہ ایراوتی مورتی کے پاس جائے کیوں کہ اسے اپنے جن دوست کی باتوں پر اب زیادہ اعتبار نہیں رہا تھا لیکن جب تھیوسانگ نے اسے یہ کہا کہ آخر ایک سنہری موقع مل رہا ہے تو اس سے کیوں نہ فائدہ اُٹھایا جائے۔

''تم ایراوتی کی مورتی کے پاس تو جاؤ۔ ممکن ہے وہ تمہیں کوئی طاقت دے دے۔ اگر طاقت نہیں دے گی تو تم سے کچھ چھین بھی تو نہیں سکتی۔ جا کر آزمانے میں کیا حرج ہے؟''

کیٹی مان گئی۔ چناں چہ ایک دن صبح صبح تھیوسانگ اور کیٹی

بابل شہر کے جنوب والے مینار کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔ پہلے تو کیٹی مذاق ہی سمجھ رہی تھی اور اسے یقین تھا کہ یہاں ایراوتی کی مورتی والا کوئی مینار نہیں ہوگا لیکن جب دریا کے کنارے انہیں دُور ایک مینار ابھرا ہوا دکھائی دیا تو تھیو سانگ کہنے لگا۔

''لگتا ہے تمہارے جن دوست نے اس بار تم سے مذاق نہیں کیا۔ وہ دیکھو، سامنے مینار موجود ہے۔''

یہ مینار ریت کے ایک ٹیلے کی دائیں جانب دریا کے کنارے پر واقع تھا اور ٹوٹا پھوٹا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ ایک عرصے سے کسی نے اس مینار کی مرمت نہیں کی۔ کیٹی مینار کے قریب آ کر کہنے لگی۔ ''تھیو سانگ! کہیں اس مینار کی کوٹھڑی میں داخل ہونے کی وجہ سے ہم کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں؟''

تھیو سانگ نے پوچھا۔ ''کیا تمہارے جن دوست نے پہلے کبھی تمہیں کسی مصیبت میں ڈالا ہے۔''

''نہیں۔'' کیٹی بولی۔ ''پہلے ایسے کبھی نہیں ہوا۔'' تو تھیو سانگ کہنے لگا۔ ''اب بھی ایسا نہیں ہوگا۔ وہ دیکھو، سامنے مینار کے نیچے ایک راستہ جاتا ہے۔ تم اس کے اندر جاؤ۔ میں باہر اسی جگہ تمہارا انتظار کرتا ہوں۔ کیوں کہ میرا تمہارے ساتھ جانا مناسب نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس مہم پر تمہیں اکیلی ہی جانا چاہیے۔''

وہاں ریت کے ٹیلے کے پاس جنگلی بیری کا ایک درخت تھا۔ تھیو سانگ اس بیری کے نیچے بیٹھ گیا اور کیٹی مینار کی طرف بڑھی۔ مینار کی حالت بڑی شکستہ تھی۔ ایک چھوٹا سا تنگ و تاریک راستہ نیچے تہہ خانے میں جاتا تھا۔ جن دوست نے یہی راستہ بتایا تھا۔ کیٹی نے جھک کر دیکھا۔ اندھیرے میں ایک زینہ نیچے جا رہا تھا۔ کیٹی زینہ اُترنے لگی۔ اب وہ ایک چھوٹی سی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں تھی۔ پہلے تو اسے اندھیرے میں کچھ نظر نہ آیا۔ پھر اس نے غور سے دیکھا تو کیا دیکھتی ہے کہ ایک عورت کا بت آدھا زمین میں دھنسا ہوا ہے۔ عورت کے بت کا صرف اوپر والا دھڑ ہی باہر تھا۔ عورت کی آنکھیں پتھر کی تھیں اور سر پر ایک چھوٹی سی کالی بلی کی مورتی بیٹھی ہوئی تھی۔

کیٹی نے پہلے تو سوچا کہ وہاں سے چلی جائے۔ کہیں جن نے اس کے ساتھ مذاق نہ کیا ہو اور وہ خواہ مخواہ کسی مصیبت میں نہ پھنس جائے۔ پھر اسے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے یہ مورتی جس کا نام ایراوتی بتایا گیا ہے، اسے سچ مچ کوئی طاقت دے دے۔ اس کے پاس بھی تو کوئی طاقت ہونی چاہیے عنبر ناگ ماریا تھیو سانگ جولی سانگ...... سب کے پاس ایک ایک طاقت ہے۔ صرف میرے پاس ہی نہیں ہے۔ میرے پاس بھی کوئی طاقت ہونی چاہیے۔ وہ سوچنے لگی اگر ایراوتی مورتی نے اس سے پوچھا کہ تمہیں کس قسم کی طاقت چاہیے تو وہ کیا جواب دے گی۔ کیٹی سوچنے لگی کہ وہ کیسی طاقت حاصل کرے؟ عنبر مر نہیں سکتا تھا۔ اس پر تلوار اثر نہیں کرتی تھی۔ ماریا غائب ہو کر فضا میں اڑتی تھی۔ ناگ سانپ بن جاتا تھا۔ تھیو سانگ انگلی سے چیزوں کو چھوٹا کر دیتا تھا۔ جولی سانگ مُردہ لاش کو چھو کر اس سے باتیں کر سکتی تھی۔ اسے کیا کرنا چاہیے؟ کیٹی کو سوچتے سوچتے خیال آیا کہ کیوں نہ وہ ایسی طاقت حاصل کرے جس کی مدد سے وہ نہ صرف یہ کہ مُردہ لاشوں سے گفتگو کرے بلکہ مُردوں کی دُنیا کی سیر بھی کر سکے اور جس مُردہ لاش کو چاہے زندہ کر کے اپنے ساتھ بھی لے کر چل سکے۔ یہ طاقت کیٹی کو بہت پسند آئی۔ وہ بڑے فخر سے پھر عنبر ناگ ماریا اور دوسرے دوستوں کو بتا سکے گی کہ اس کے پاس ایسی طاقت ہے جو ان میں سے کسی کے پاس نہیں ہے۔

یہ سوچ کر کیٹی فرش میں آدھی دھنسی ہوئی ایراوتی کی مورتی کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔

''اے ایراوتی کی مورتی! میں مورتیوں اور بتوں کی قائل نہیں ہوں لیکن مجھے تمہارے پاس جن دوست نے بھیجا ہے۔ کیا تو اسے جانتی ہے؟''

کوٹھڑی میں تیز ہوا کا جھونکا آ کر گزر گیا۔ شوکر کی آواز آئی اور ایراوتی کے بت میں حرکت پیدا ہوئی۔ ایراوتی کے بت نے گردن ذرا سی اوپر اُٹھا کر اپنی پتھریلی آنکھوں سے کیٹی کی طرف دیکھا اور عجیب سی مردانہ آواز میں کہا۔

''جس نے تجھے میرے پاس بھیجا ہے، میں اس کا بڑا احترام کرتی ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس نے تمہیں میرے پاس کیوں بھیجا ہے۔ بول تو مجھ سے کس قسم کی طاقت حاصل کرنا چاہتی ہے۔''

کیٹی بڑی خوش ہوئی۔ کہنے لگی۔ ''ایراوتی! مجھے ایسی طاقت دے دے کہ میں پرانے اور نئے مُردے سے باتیں کر سکوں۔ اس کے ساتھ مل کر مُردوں کی دُنیا کی سیر کر سکوں اور جب چاہوں لاش کو زندہ کر کے اپنے ساتھ رکھ سکوں۔''

ایراوتی کی مورتی ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئی۔ پھر اس کی آواز آئی۔ ''یہ طاقت تو میں تمہیں دے سکتی ہوں مگر اس میں کچھ خطرے بھی ہیں۔ کیا تم ان خطروں کو قبول کرتی ہو؟''

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

کیٹی نے پوچھا۔ ''مثلاً کون سے خطرے ہیں؟''

ایراوتی کی مورتی نے کہا۔ ''مثلاً اس میں یہ خطرہ بھی ہے کہ مُردہ لاش کو اگر تم پسند آ گئیں تو وہ تمہیں اپنی دُنیا میں لے جائے گی اور پھر تم قیامت تک مُردوں کی دُنیا سے باہر نہ آ سکو گی۔''

کیٹی سوچ میں پڑ گئی۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر وہ کیا کرے گی۔ اس نے کہا۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی مُردہ لاش مجھے پسند ہی نہ کرے؟ یا پھر میں کسی طریقے سے مُردوں کی دُنیا سے واپس آ جاؤں؟''

ایراوتی کی مورتی نے کہا۔ ''ایسا کوئی طریقہ میرے پاس نہیں ہے۔ یہ خطرہ تمہاری طاقت کے ساتھ ساتھ رہے گا۔ اگر تمہیں منظور ہے تو میں تمہیں ابھی یہ طاقت دیئے دیتی ہوں۔''

کیٹی الجھن میں پڑ گئی۔ اسے نئی طاقت حاصل کرنے کا شوق بھی تھا اور یہ خدشہ بھی تھا کہ کوئی مُردہ اسے پسند کر کے اپنی دُنیا میں لے گیا تو وہ کیا کرے گی؟ اس نے دل میں سوچا کہ وہ کسی مُردہ لاش سے بے تکلف نہ ہو گی اور ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گی کہ مُردہ لاش اسے پسند کرنے لگے۔ اس نے ایراوتی سے کہا۔

''میں یہ خطرہ مول لینے کو تیار ہوں۔ مجھے یہ طاقت دے دو۔''

ایراوتی کی مورتی نے کہا۔ ''کیٹی! ایک بار پھر سوچ لو کیوں کہ ایک بار تمہیں یہ طاقت مل گئی تو پھر واپس نہیں لی جا سکے گی اور یہ خطرہ تمہارے ساتھ رہے گا۔''

کیٹی دل میں پکا فیصلہ کر چکی تھی۔ کہنے لگی۔ ''ایراوتی کی مورتی! مجھے منظور ہے۔ میں نے طاقت حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔''

ایراوتی کی مورتی بولی۔ ''میں ایک بار پھر تمہیں یہ بتانا اپنا فرض سمجھتی ہوں کہ اگر اس طاقت کی وجہ سے تم کسی مصیبت میں پھنس گئیں تو پھر نہ میں تمہاری مدد کر سکوں گی اور نہ تمہارا جن دوست ہی تمہاری مدد کو پہنچ سکے گا۔''

کیٹی نے کہا۔ ''میں نے سب کچھ سوچ کر فیصلہ کیا ہے ایراوتی! تم مجھے یہ طاقت دے دو۔''

ایراوتی کی مورتی خاموش ہو گئی۔ اس کے سر پر بیٹھی ہوئی بلی کی زرد آنکھیں چمکنے لگیں۔ ایراوتی کی مورتی نے کہا۔ ''کیٹی! تم جس جگہ کھڑی ہو اسی جگہ کھڑی رہنا اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلنا۔''

کیٹی جہاں کھڑی تھی وہاں جم گئی۔ ایراوتی کی مورتی کے سر پر جو کالی بلی بیٹھی تھی۔ اچانک اس کی آنکھوں سے روشنی کی شعاعیں نکل کر کیٹی کے جسم پر پڑیں۔ کیٹی کو ایسے محسوس ہوا کہ اس کے جسم میں آگ لگا دی ہے۔ وہ اپنی جگہ پر ایک فٹ اوپر کو اچھلی اور پھر ہمت کر کے وہیں کھڑی ہو گئی۔ بلی کی آنکھوں کی زرد روشنی ابھی تک اس کے جسم میں داخل ہو رہی تھی۔ پھر بلی کی آنکھوں کی روشنی ایک دم سے بند ہو گئی۔ کیٹی کا جسم جو گرم ہو گیا، آہستہ آہستہ اپنی درست حالت پر آ گیا۔ ایراوتی کی مورتی نے کہا۔

''کیٹی! تمہیں مبارک ہو۔ جس طاقت کی تم نے خواہش کی تھی، وہ تمہیں مل گئی ہے۔ جاؤ اور اس طاقت کو کسی مُردہ لاش پر آزما کر دیکھ لو۔ ہاں! ایک بات یاد رکھنا۔ مُردہ لاش تمہیں دُنیا اور دُنیا کے بعد کی بہت سی باتیں بتائے گی مگر جن باتوں کی بتانے کی اسے اجازت نہیں ہو گی وہ راز تمہیں کبھی نہیں بتائے گی اور ایسے راز بتانے

کے لیے کسی مُردہ لاش کو مجبور بھی نہ کرنا۔ کیا تم وعدہ کرتی ہو؟''
کیٹی نے کہا۔ ''میں وعدہ کرتی ہوں۔''
ایراوتی کی مورتی نے کہا۔ ''یہ میں تمہیں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ مرنے کے بعد کی دُنیا ایک راز ہے اور اس کی بعض باتیں ایسی ہیں جو زندہ انسانوں کو کبھی نہیں بتائی جاسکتیں۔ ان باتوں کا راز مرنے کے بعد ہی کھلتا ہے۔ اب تم جاؤ۔''
کیٹی نے ایراوتی کی مورتی کا شکریہ ادا کیا مگر مورتی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ دوبارہ پتھر کی مورتی بن چکی تھی۔ کیٹی خوش خوش مینار والے تہہ خانے سے باہر آ گئی۔ بیری کے درخت کے نیچے تھیو سانگ اس کے انتظار میں بیٹھا گھڑیاں گن رہا تھا۔ کیٹی جب اس کے پاس آئی تو تھیو سانگ نے پوچھا۔ ''کہو! کیا تمہیں کوئی نئی طاقت ملی؟'' کیٹی کا چہرہ خوشی سے کھلا ہوا تھا۔ کہنے لگی۔ ''تھیو سانگ بھائی! اب تم لوگ مجھے یہ طعنہ نہیں دے سکتے کہ میرے پاس کوئی طاقت نہیں ہے۔ اب مجھے بھی ایک ایسی طاقت مل گئی ہے جو تم میں سے کسی کے پاس نہیں ہے۔''
تھیو سانگ اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''بڑی خوشی کی بات ہے کیٹی مگر کچھ مجھے بھی تو بتاؤ کہ ایراوتی کی مورتی نے تمہیں کون سی طاقت عطا کی ہے۔''
جب کیٹی نے اسے اپنی طاقت کے بارے میں بتایا تو تھیو سانگ بڑا خوش ہوا۔ کہنے لگا۔ ''یہ تو بڑی کمال کی طاقت ہے کیٹی! جولی سانگ تو صرف مُردہ لاش سے باتیں ہی کر سکتی ہے مگر تم تو مُردہ لاش کو زندہ کر کے اپنے ساتھ بھی رکھ سکو گی اور مُردوں کی دُنیا کی سیر بھی کیا کرو گی۔''
کیٹی نے کچھ فکرمند سا ہو کر کہا۔ ''لیکن اس میں ایک خطرہ بھی ہے تھیو سانگ؟''
''کون سا خطرہ؟'' تھیو سانگ نے تعجب سے پوچھا۔
کیٹی نے کہا۔ ''ایراوتی نے کہا ہے کہ اگر کسی مُردہ لاش نے مجھے پسند کر لیا تو میں کسی ایسی مصیبت میں پھنس سکتی ہوں جس سے نجات حاصل کرنا ناممکن ہو جائے گا۔''
تھیو سانگ ہنستے ہوئے بولا۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ کوئی مہینہ ایسا نہیں گزرتا ہوگا جس میں ہم کسی مصیبت میں نہ پھنسیں اور دُنیا کی کوئی مصیبت ایسی نہیں کہ جس میں پھنس کر ہم اس سے باہر نہ نکل آتے ہوں۔ اس لیے ایسی فکر کرنی تو بیکار ہے۔ رہی یہ بات کہ کوئی مُردہ تم پر عاشق ہو جائے گا تو یہ بڑی دل چسپ بات ہوگی۔ میں دیکھنا چاہوں گا کہ کون سا مُردہ تم پر عاشق ہوتا ہے۔''
کیٹی نے ناراض ہو کر کہا۔ ''تھیو سانگ! تم کو مذاق سوجھ رہا ہے اور مجھے پریشانی لگی ہے کہ میری طاقت کہیں مجھے کسی مشکل میں گرفتار نہ کر دے۔''
تھیو سانگ نے کیٹی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ کوئی مُردہ کبھی کسی پر عاشق نہیں ہوا کرتا، اب آؤ چل کر جولی سانگ کو تلاش کرتے ہیں۔''
کیٹی نے کہا۔ ''لیکن پہلے میں اپنی طاقت تو آزما کر دیکھ لوں۔ چلو پہلے کسی قبرستان میں چل کر میں اپنی طاقت کا امتحان لیتی ہوں۔''
''ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی مُردہ ہمیں جولی سانگ کے بارے میں بتا دے۔'' تھیو سانگ نے یہ کہا اور وہ کسی قبرستان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ شہر سے باہر کوئی قبرستان انہیں نہ ملا۔ وہ شہر بابل کے اندر چلے آئے۔ آخر ایک جگہ پُرانے قلعے کی دیوار کے پیچھے انہیں ایک قبرستان مل گیا۔ اس قبرستان میں کچھ نئی بنی ہوئی قبریں بھی تھیں اور پرانی قبریں بھی تھیں۔ تھیو سانگ نے مشورہ دیا کہ ہمیں کسی پُرانی قبر کے مُردے کو زندہ کرنا چاہیے۔ کیٹی کہنے لگی۔ ''میں کسی مُردہ عورت کی لاش کو زندہ کرنا زیادہ پسند کروں گی۔ کم از کم وہ مجھ پر عاشق تو نہیں ہوگی۔''
تھیو سانگ بولا۔ ''مگر پُرانے زمانے میں عورتیں بھی عورتوں سے پیار کرتی رہی ہیں۔''
کیٹی نے کہا۔ ''میں اسے نہیں مانتی۔ کم از کم میرے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔ اگر وہ مجھ پر عاشق ہو بھی گئی تو میں اسے اپنی بہن بنا لوں گی اور اس کے ساتھ مُردوں کی دُنیا میں نہیں جاؤں گی کیوں کہ ایراوتی کی مورتی نے کہا تھا کہ جو مُردہ تم پر عاشق ہوگا وہ تمہیں مُردوں کی دُنیا میں لے جائے گا اور پھر وہاں سے تم باہر نہ نکل سکو گی۔'' تھیو سانگ بولا۔ ''تو پھر چلو کسی عورت کی قبر پر چلتے ہیں۔''
آج سے ہزاروں برس پہلے بھی قبروں کے پیچھے پتھر لگا کر اس پر مرنے والے یا مرنے والی کا نام اور عمر لکھ دی جاتی تھی۔ ایک قبر پر بیس برس کی مُردہ عورت کا نام لکھا ہوا تھا۔ یہ نام لوشیا تھا۔ اس قبر میں بیس برس کی نوجوان لڑکی لوشیا کی لاش دفن تھی۔ قبر سے معلوم ہوتا تھا کہ لوشیا کو مرے زیادہ دن نہیں ہوئے۔ قبر بالکل نئی بنی ہوئی تھی۔ کیٹی نے ادھر ادھر دیکھا اور بولی۔ ''ابھی دن کا وقت ہے تھیو سانگ اور کچھ لوگ بھی قبرستان میں نظر آ رہے ہیں۔ ہم ان کے سامنے قبر نہیں کھول سکتے۔''
(باقی آئندہ)

آپ بھی لکھیے

مٹی کی محبت

(عائشہ الیاس، کراچی)

ہم دونوں بچپن کے دوست تھے۔ ہماری دوستی اتنی گہری تھی کہ ہر کوئی رشک کرتا تھا۔ ہمارے گھر بھی ساتھ ساتھ تھے اور پھر اسکول بھی ایک ہی تھا۔ ہم پورا دن ساتھ گزارتے تھے۔ ہم ساتھ کھیلتے، ساتھ پڑھتے اور ساتھ شرارتیں کرتے تھے۔ جب ہم لڑکپن میں داخل ہوئے تو ہماری دوستی مزید گہری ہوگئی۔ ہم نے میٹرک کے بعد اکٹھے ایک ہی کالج میں داخلہ لے لیا اور ایک ہی جیسے مضامین منتخب کیے۔ کالج کا دور بہت ہی بے فکری کا دور تھا۔ ہم نے اس دور میں خوب لطف اُٹھایا۔

جب ہم نے انٹر کر لیا تو کیرئیر کے انتخاب کا مرحلہ سامنے آیا۔ میرا خواب انجینئر بن کر بیرون ملک جانے کا تھا جب کہ رمیز آرمی جوائن کرنا چاہتا تھا۔ میں اس کے آرمی جوائن کرنے کا مخالف تھا اور چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ ہی انجینئرنگ میں داخلہ لے لیکن اس نے میری بات نہ مانی اور کمیشن کے لیے درخواست دے دی۔ میں اپنی بات رد کیے جانے پر اس سے ناراض ہوگیا۔

جس دن اس کا سلیکشن ہوا، اُس دن وہ میرے پاس آیا اور مجھے منانے کی کوشش کی۔ میں مان تو گیا کیوں کہ ہم بچپن کے دوست تھے لیکن دل سے اس کے اس انتخاب پر راضی نہ ہوا۔ میرے خیال میں وہ بے وقوفی کر رہا تھا۔ تھوڑے دن بعد وہ ٹریننگ کے لیے چلا گیا اور میں نے انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ ہم دونوں نے شروع میں تو ایک دوسرے کی کمی بہت شدت سے محسوس کی لیکن آہستہ آہستہ ہم عادی ہوگئے۔ وہ جب بھی چھٹیوں پر آتا تو مجھ سے ضرور ملتا، پھر ہم دونوں مل کر خوب سیر و تفریح کرتے، خوب باتیں کرتے۔ وہ مجھے اپنی اکیڈمی کے قصے سناتا اور میں اسے اپنی یونیورسٹی کی باتیں بتاتا۔ وقت یوں ہی گزرتا رہا۔ میں نے اپنی انجینئرنگ کی ڈگری مکمل کر لی اور بیرون ملک روانہ ہوگیا۔ میرے سر پر صرف دولت کمانے کی دھن سوار تھی۔ میں نے جان لیا تھا کہ میرے ملک میں میرے لیے کچھ بھی نہیں رکھا ہوا، یہ ملک مجھے کچھ بھی نہیں دے سکتا، یہاں رہ کر مجھے کچھ بھی حاصل نہیں ہونے والا جب کہ بیرون ملک جا کر میں خوب دولت کما سکتا ہوں اور ہوا بھی یہی کہ میں نے بیرون ملک جا کر خوب دولت کمائی اور اپنی ان تمام صلاحیتوں کو جن کا اصل حقدار میرا ملک تھا، غیر ممالک کی بہتری کے لیے صرف کر دیا۔ دوسری طرف رمیز آرمی میں میجر بن چکا تھا۔ میرا اس سے رابطہ اب بہت کم ہوگیا تھا۔ ہم دونوں اپنی اپنی زندگیوں میں بے حد مصروف ہو چکے تھے۔ سال میں کبھی ایک دو بار اس کا فون آ جاتا یا میں اسے فون کر لیتا تو ہماری بات ہو جاتی تھی لیکن ہماری بالمشافہ ملاقات کو کئی برس گزر چکے تھے اور میں نہیں جانتا تھا کہ اب ہماری ملاقات ہوگی بھی تو کس حال میں...... ایک دن صبح جب میں بیدار ہوا تو میرے موبائل کی گھنٹی بجی۔ میں نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف میری امی تھیں۔ انہوں نے جو خبر مجھے سنائی، اس نے میرے حواس معطل کر کے رکھ دیے۔ میرا دوست، میرا بہترین دوست، میجر رمیز دنیا سے جا چکا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا اور جب یقین آیا تو میں پہلی فلائٹ سے پاکستان آ پہنچا۔ جب میں گھر کے قریب اُترا تو رمیز کے گھر کے سامنے ایمبولینس کھڑی دیکھی۔ ایمبولینس سے شہید کا جسدِ خاکی اُتارا جا رہا تھا۔ تھوڑی دور شہید کی والدہ انتہائی صبر و ضبط کا پیکر بنی کھڑی تھیں۔ ان کا بیٹا مادرِ وطن کا دفاع کرتے ہوئے شہید ہوا تھا۔ اس نے مٹی کی محبت میں اپنی جان قربان کر دی تھی۔ وطن کی مٹی اس کے لہو کی گواہ تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر شہید کا چہرہ دیکھا۔ ایک ابدی مسکراہٹ اس کے لبوں کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ اس کے بدن سے خون ابھی تک جاری تھا۔ خاکی وردی لہو سے تر تھی۔

میری آنکھیں اشکوں سے لبریز ہوگئیں۔ میرے عزیز دوست نے اپنی جان مٹی کی محبت میں وار دی تھی جب کہ میں اس مٹی سے منہ موڑ کر بھاگ گیا تھا۔ اس لمحے مجھے اپنا شہید دوست انتہائی عظیم

مرتبے پر کھڑا نظر آیا۔ میں نے اسی دم تہیہ کرلیا کہ میں اپنی جان نہ سہی، اپنی صلاحیتوں سے تو ضرور اپنی مٹی کو فائدہ پہنچاؤں گا تا کہ میں بھی اپنے شہید دوست کی طرح مٹی سے محبت کرنے والوں کی فہرست میں شامل ہو جاؤں۔ (پہلا انعام:195 روپے کی کتب)

چڑیا بی

(محمد طلحہ نذیر، کراچی)

منے میاں اس دن بہت خوش تھے اور خوش کیوں نہ ہوتے، ان کے کمرے کی کھڑکی کے سامنے جو درخت تھا، اس پر چڑیا بی کے تین چھوٹے چھوٹے پیارے سے بچے انڈوں سے نکلے تھے۔ صبح اسکول جاتے وقت وہ روز چڑیا بی کو دانہ ڈالتے تھے، لیکن آج انہوں نے بچوں کی وجہ سے زیادہ دانا ڈالا تھا تا کہ چڑیا بی اپنے بچوں کا پیٹ بھر سکے۔ اسکول سے آتے ہی وہ اپنی کھڑکی سے گھونسلے میں جھانکنے لگے۔ تین چھوٹے چھوٹے سے منے چڑیا بی کے ساتھ سو رہے تھے۔ منے میاں کی امی کمرے میں داخل ہوئیں اور بولیں: ''بیٹا! آؤ جلدی سے کھانا کھا لو۔'' ''مما! چڑیا کے بچے کتنے پیارے ہیں ناں! جب یہ بڑے ہو جائیں گے، میں ان سے دوستی کرلوں گا اور روز باجرہ اور کنگنی کھلایا کروں گا۔'' منے میاں نے امی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں بیٹا! لیکن یوں روز روز چڑیا کے بچوں کو مت دیکھا کرو۔ وہ ناراض ہو جائیں گے۔ اب جلدی سے کھانا کھا لو اور پھر چڑیا کے بچوں کی طرح آپ بھی سو جانا۔'' منے میاں کی امی نے پیار سے سمجھایا اور وہ کھانا کھانے کے لیے چل پڑے۔ اگلے دن منے میاں جب اسکول سے واپس آئے اور گھونسلے کی طرف دیکھا تو وہ چونک اُٹھے اور رونے لگ گئے۔ ان کی امی کمرے میں داخل ہوئیں اور پوچھا: ''کیا ہوا بیٹا! ایسے کیوں رو رہے ہو۔'' ''م......مم......ما......مما...... وہ...... چڑیا......بی کا ایک بچہ مر گیا ہے۔'' منے میاں نے روتے روتے اپنی سرگزشت بیان کر دی۔ امی نے جھانک کر گھونسلے میں دیکھا تو ایک بچہ مردہ پڑا تھا۔ چڑیا بی پریشانی کے عالم میں ''چوں...... چوں...... چوں'' کر رہی تھی۔ امی نے آرام سے وہ چڑیا کا بچہ اُٹھایا اور اپنے گھر کی کیاریوں میں مٹی کھود کر دفن کر دیا۔ منے میاں اس دن بہت مغموم رہے اور صبح سے کھانا بھی نہیں کھایا۔ صحیح طرح سوئے بھی نہیں لیکن رات کو ان کے بابا جانی نے جب ان کو سمجھایا تو ان کا دل بہل گیا۔ کچھ دنوں بعد چڑیا بی کے دو بچوں نے اُڑنا شروع کر دیا تھا اور منے میاں بہت خوش تھے۔ بچے ایک شاخ سے دوسری شاخ پر پھدکتے تھے اور منے میاں ان کو بہت خوشی کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ وہ بچہ جس کا نام منے میاں نے ''براؤنی'' رکھا تھا، ایک شاخ پر بیٹھ کچھ چگ رہا تھا کہ اچانک درخت کی ٹہنی ٹوٹ گئی اور وہ نیچے جا گری۔ ساتھ ہی براؤنی بھی نیچے جا گرا۔ وہ ابھی اتنا بڑا نہیں ہوا تھا کہ صحیح طرح اُڑ سکتا، چناں چہ وہ بھی نیچے جا گرا۔ منے میاں اپنے گھر کے باغیچے کی طرف بھاگے مگر جب وہ پہنچے تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ بھی مر چکا تھا۔ منے میاں بہت روئے۔ انہوں نے اپنی امی کی طرح براؤنی کو بھی کیاریوں میں مٹی کھود کر دفن کر دیا۔ اس دن وہ اور بھی مغموم رہے۔ انہوں نے کھانا بالکل نہیں کھایا۔ امی بہت بہلاتی رہیں لیکن انہوں نے بالکل نہیں کھایا۔ ان کی امی نے پیار سے کہا: ''بیٹا! آپ کو معلوم ہے کہ انسان کا بھی بالکل یہی طریقہ ہے؟'' ''کیا مطلب!'' منے میاں حیرانی سے بولے۔ ''انسان جب دُنیا میں آتا ہے تو لوگ بہت خوش ہوتے ہیں لیکن جب انسان دُنیا سے جاتا ہے تو لوگ بہت مغموم ہوتے ہیں۔ انسان دُنیا سے جب چلا جاتا ہے تو آخرت میں اس کو وہی نیکیاں کام دیتی ہیں جو اس نے اس مختصر عرصۂ حیات میں سرانجام دی ہوتی ہیں۔ لوگوں کا رونا اس کو کوئی فائدہ نہیں دیتا۔ چناں چہ جب ہم اچھے اچھے اعمال کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہم سے بہت خوش ہوں گے اور جب ہم اس دُنیا سے چلے جائیں گے تو پھر ہمیں یہ نیکیاں کام آئیں گی۔'' منے میاں حیرت سے پلکیں جھپکا رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ جس طرح یہ بچہ ہنستا کھیلتا اچانک اس دُنیا سے چلا گیا، اسی طرح انسان بھی اچانک اس دُنیا سے چلا جائے گا، اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اس کی عمر بہت بڑی ہو، وہ بالکل چھوٹا بھی ہو تو اس طرح دُنیا سے جا سکتا ہے جس طرح چڑیا کا یہ بچہ اس دُنیا سے چلا گیا لہٰذا ہر وقت نیک اعمال کرتے رہنا چاہئیں، نہ جانے کب بلاوا آ جائے۔

(دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

کتاب کی فریاد۔ آپ بیتی

(عبدالرزاق گبول، ڈیرہ غازی خان)

میں ایک پُرانی کتاب ہوں اور ایک لائبریری کی الماری میں پڑی ہوں۔ میرے ساتھ میری کئی سہیلیاں ہیں جو مجھ سے زیادہ خوب صورت ہیں۔ وہ ہر وقت مسکراتی رہتی ہیں مگر میں اداس رہتی ہوں کیوں کہ میرا دل زخموں سے چور ہو چکا ہے۔ میرا جسم ٹکڑوں میں بٹ رہا ہے اور میں ہر وقت درد سے کراہتی رہتی ہوں۔ بیس سال پہلے

میں بھی ایک خوب صورت کتاب تھی۔ میرے جسم پر خوب صورت لباس تھا۔ جلد ساز نے مجھے اچھے طریقے سے ایک کارٹن میں بند کر کے کتابوں کی ایک دُکان پر پہنچا دیا۔ دُکان دار نے مجھے ایک الماری میں سجا کر رکھ دیا۔ دُکان پر ہر طرح کے لوگ آتے اور مجھے اُٹھا اُٹھا کر دیکھتے تھے۔ میرا سر فخر اور غرور سے اونچا ہو جاتا تھا۔ بہت سے لوگ مجھے پسند کرتے تھے لیکن اپنے ساتھ نہیں لے جا پاتے تھے، شاید وہ میری قیمت ادا کرنے کے قابل نہیں تھے۔ ایک دن مجھے مجھ جیسی بہت سی کتابوں کے ساتھ ایک کارٹن میں بند کر کے گاڑی میں لاد کر اس لائبریری میں پہنچا دیا گیا جہاں اب میں زندگی کے شب و روز گزار رہی ہوں۔ لائبریری والوں نے مجھ پر ایک نمبر لگایا اور میرا نام ایک رجسٹر میں نوٹ کر کے مجھے ایک الماری میں سجا دیا۔ سب سے پہلے مجھے ایک اسکول ٹیچر نے لائبریری سے جاری کروایا اور ایک تھیلے میں ڈال کر اپنے گھر لے گئے۔ انہوں نے گھر جاتے ہی تھیلا اپنی بیوی کے حوالے کر دیا۔ ان کی بیگم جو اس وقت سبزی بنا رہی تھی اس نے تھیلا کھول کر دیکھا تو مجھے پا کر بہت خوش ہوئی لیکن مجھے اس سے مل کر بڑا دکھ ہوا کیوں کہ اس نے میرے جسم پر سبزی کے داغ لگا دیئے تھے۔ اسکول ٹیچر کی بیوی نے میرے صفحے الٹ پلٹ کر مجھے پھر سے تھیلے میں ڈال دیا۔ رات کو اسکول ٹیچر جب تمام کاموں سے فارغ ہو گئے تو انہوں نے پڑھا۔ کئی دن کے بعد ان کی بیگم مجھے لے کر بیٹھ گئیں، پھر ان کے بیٹے نے مجھے بڑے شوق سے پڑھا اور پھر مجھے لائبریری میں پہنچا دیا۔ میں اپنی قدر و قیمت دیکھ کر بڑی خوش ہوئی لیکن اس کے بعد مجھے بڑی تکلیف اُٹھانی پڑی کیونکہ اکثر طلباء مجھے اپنے گھر لے جا کر بڑے شوق سے پڑھتے رہے لیکن کسی نے میری حفاظت نہیں کی۔ میرا جسم رنگ برنگ زخموں سے بھر گیا۔ بعض لڑکوں نے تو میرے جسم پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچ دیں اور میری خوب صورتی بالکل ختم ہو کر رہ گئی۔ بعض طالب علموں نے تو میرے صفحے بھی پھاڑ دیئے تھے۔ میں بہت روئی چیخی لیکن کسی نے میری ایک نہیں سنی۔ میرے صفحے میرے جسم سے الگ ہوتے رہے اور گم ہوتے رہے لیکن کسی نے میری کوئی پرواہ نہیں کی۔ اب میرا یہ حال ہے کہ میں زخموں سے چور ہو چکی ہوں اور کوئی مجھے پڑھنے کے لیے لے کر نہیں جاتا۔ میری دوسری سہیلیاں آتی جاتی رہتی ہیں تو میرا دل کرتا ہے میں بھی باہر جا کر دُنیا دیکھوں لیکن کوئی مجھ پر توجہ ہی نہیں دیتا۔ بس ایک جگہ پر پڑی رہتی ہوں اور اپنے ماضی کو یاد کر کے خوش ہو لیتی ہوں۔ مجھے ایک بات کی خوشی بھی ہے کہ مجھے بہت سے لوگوں نے پڑھا اور مجھ سے علم حاصل کیا۔ میرے اندر دانش و حکمت کے جو موتی چھپے ہوئے ہیں وہ زبان در زبان دوسروں تک آج بھی پہنچ رہے ہیں۔ آج بھی بہت سے لوگ میرے دیئے ہوئے مشوروں پر عمل پیرا ہو کر دین اور دُنیا کی بھلائی کا کام کر رہے ہیں۔

(تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

پرہیزگار

(محمد زبیر جمشید، جہانیاں)

رمضان المبارک کے مہینے کا آغاز ہو چکا تھا اور گرمی بھی زوروں پر پڑ رہی تھی۔ گرمی کی وجہ سے کوئی پرندہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ گرمی کی شدت سے ہر انسان اور حیوان کی آواز دب گئی تھی۔

آج رمضان المبارک کا چھٹا روزہ تھا۔ حماد کے گھر والے تمام افراد اپنے اپنے کمروں میں سو رہے تھے۔ حماد ہی تھا جو اپنے کمرے میں ابھی جاگ رہا تھا۔ آج اس کا تیسرا روزہ تھا۔ دوپہر کا وقت تھا کہ اسے پیاس کی شدت ستانے لگی۔ پیاس کی وجہ سے اس کا منہ بار بار خشک ہو رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ابھی جائے اور فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل کو منہ سے لگا لے۔ کچھ دیر گزر جانے کے بعد اس سے پیاس کی شدت برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ کچھ سوچے سمجھے بغیر وہ کچن میں گیا اور فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل کو نکال لیا۔ اپنے والدین کو سوتا پا کر اس نے بوتل کو اپنے بغل میں لے لیا اور اپنے کمرے کی طرف دبے پاؤں آنے لگا۔

کمرے میں پہنچتے ہی بوتل کو اپنے منہ کی طرف لے جانے لگا۔ بوتل کا اس کے منہ سے بہت ہی کم فاصلہ تھا کہ اس کے کانوں میں ایک آواز ٹکرائی۔ ''تم ایسا مت کرو۔'' ''یہ کس کی آواز ہے؟'' اس نے بوتل کو میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ یہ اس کا ضمیر تھا جو اسے روک رہا تھا۔ حماد نے اپنے ضمیر کا مقابلہ کرتے ہوئے بوتل کو پھر سے اپنے منہ کی طرف لے جانے کی کوشش کی کہ اسے پچھلے جمعہ میں مولوی صاحب کی باتیں یاد آنے لگیں۔ مولوی صاحب نے کہا۔ ''روزے کو عربی زبان میں ''صوم'' کہتے ہیں۔ صوم کے لغوی معنی ''رک جانے کے ہیں'' اس کا مفہوم ہے کہ صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب ہونے تک کھانے پینے اور روزہ توڑنے

والی چیزوں سے رُک جانا۔'' جیسا کہ آپ مسجد میں بیٹھے تمام لوگ جانتے ہیں کہ سورۃ بقرہ کی آیت نمبر 183 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض تھے تاکہ تم لوگ پرہیزگار بن جاؤ۔''

مولوی صاحب چند لمحوں کے لیے چپ ہوئے کہ پھر سے ان کی آواز مسجد میں گونجنے لگی۔ مولوی صاحب نے کہا۔ ''اس کا مفہوم کچھ اس طرح بیان کرنے لگا ہوں کہ ''روزہ ایک ایسی فرضی عبادت ہے جو انسان ایک دوسرے کو دکھانے کے لیے نہیں بلکہ اپنے رب کو دکھانے کے لیے رکھتا ہے کہ وہ اپنے رب کے قریب کتنا متقی اور پرہیزگار ہے۔

ایک نیک انسان چاہے تو پانی پی کر اپنی پیاس بجھا سکتا ہے لیکن وہ ایسا اس لیے نہیں کرتا کیوں کہ اس کا خدا اسے دیکھ رہا ہوتا ہے، جس کے لیے اس نے روزہ رکھا ہوتا ہے۔ روزہ رکھیں تو خالص اپنے رب کے لیے رکھنا چاہیے تاکہ خدا ہم سے راضی ہو جائے۔''

''حماد! یہ کیا کر رہے ہو؟'' ابو جان کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ حماد کی آنکھوں میں آنسو تھے، وہ یہ سوچ رہا تھا کہ میں اپنے رب کے نزدیک کتنا پرہیزگار بندہ ہوں۔ اس نے والد کو تمام واقعہ سنایا اور گلے لگ کر آنسو بہانے لگا۔ اس نے اپنے ابو جان سے عہد کیا کہ وہ دوبارہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔ اس کے ابو نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور ظہر کی نماز ادا کرنے کے لیے مسجد کی طرف لے گئے۔ (چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

انجام

(عبدالرحمٰن، راولپنڈی)

جنید پڑھنے لکھنے میں بہت اچھا تھا۔ وہ بڑوں کا ادب بھی کرتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ ہر کام اپنے وقت پر کرتا تھا، اس کا سب سے اچھا دوست احسن تھا۔ وہ دونوں اسکول بھی ساتھ جاتے تھے اور بعض اوقات جب امتحان ہوتے تھے تو وہ اکٹھے پڑھتے تھے۔ جنید ہمیشہ کلاس میں احسن کے آگے پیچھے پوزیشن لیتا۔ کبھی وہ اوّل آتا تو کبھی احسن۔ یوں زندگی کا پہیہ گھوم رہا تھا۔

ایک دن جب جنید، احسن کے گھر گیا تو وہ بہت خوش تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے چچا محمود دبئی سے آئے تھے اور اس کے لیے نیا کمپیوٹر اور بہت سی گیمز بھی لائے تھے۔ احسن، جنید کو اپنے کمرے میں لے گیا جہاں اس کا نیا کمپیوٹر رکھا ہوا تھا۔ احسن نے کمپیوٹر پر گیم آن کی اور جنید کو اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ جنید کو احسن کے ساتھ مل کر کمپیوٹر گیمز کھیلنے میں بڑا مزہ آ رہا تھا۔ جنید نے اپنے پاپا سے فرمائش کی کہ اسے نیا کمپیوٹر اور گیمز لا کر دیں۔ اس کے پاپا نے اس کی فرمائش پوری کر دی۔ اب تو جنید گھنٹا گھنٹا بھر کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا گیمز کھیلتا رہتا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی پڑھائی متاثر ہونے لگی اور صحت بھی خراب ہوگئی، کیوں کہ وہ کوئی بھی کام اپنے مقررہ وقت پر نہ کرتا تھا۔ نہ وقت پر کھانا کھاتا اور نہ کھیلنے کے لیے باہر پارک کا رُخ کرتا بلکہ اس کی پڑھائی پر سے بھی توجہ ہٹ گئی۔ وہ پہلے والی محنت نہ کر رہا تھا جس کے برعکس احسن وقت پر سارے کام کرتا اور مقررہ وقت پر کمپیوٹر گیمز کھیلتا اور بیشتر وقت پڑھائی پر دیتا۔ یوں وقت پَر لگا کر اڑتا رہا...

پھر بالآخر امتحانات سر پر آن کھڑے ہوئے اور جنید کی تیاری مکمل نہیں ہوئی جب کہ احسن نے امتحانات کی پورے زور و شور سے تیاری کی۔ ہوا یہ کہ احسن نے امتحانات میں عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پہلی پوزیشن حاصل کر لی جب کہ جنید کے امتحانات اچھے نہ ہونے کی وجہ سے وہ جو پہلی پوزیشن پر آتا تھا، کلاس میں چھٹی پوزیشن حاصل کی۔ احسن کو بڑا افسوس ہوا کہ اس کا دوست جو پہلی پوزیشن لیتا تھا اب چھٹے نمبر پر آیا ہے۔

شام کو جب احسن، جنید کے گھر گیا تو وہ کمپیوٹر پر گیمز کھیل رہا تھا۔ احسن کو دیکھ کر جنید نے مبارک باد دی۔ جب احسن نے اس کو باہر کھیلنے کا کہا تو اس نے منع کر دیا اور بہت بُرے لہجے میں منع کیا تو احسن وہاں سے چلا گیا۔ اتوار کا دن تھا، جنید صبح سے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا تھا اور اب رات ہو چکی تھی۔ اچانک اس کا سر چکرانے لگا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

جب آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو اپنے کمرے کے بستر پر لیٹا پایا اور اس کے سرہانے اس کے پاپا، مما اور احسن کھڑے تھے۔ جنید کے پوچھنے پر اس کی مما نے بتلایا کہ جب تم کافی دیر تک گیمز کھیلتے رہے تو تمہیں چکر آئے اور تم کرسی سے زمین پر بے ہوش ہو کر گر پڑے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا ہے کہ زیادہ گیمز کھیلنے سے تیز شعاعوں نے تمہاری آنکھوں کی نظر کو کمزور کر دیا ہے، جس کی وجہ سے تمہیں اب سے نظر کا چشمہ لگانا پڑے گا۔ یہ کہہ کر جنید کی مما نے اس کا نظر کا چشمہ آگے بڑھا (بقیہ: صفحہ نمبر 54)

اسامہ منور

بھکاری

جیسے ہی ٹریفک سگنل کی سرخ بتی جلی، تمام ٹریفک رُک گئی۔ ابھی گاڑیوں کے پہیے چرچرا رہے تھے کہ اتنے میں سڑک کی دائیں طرف سے بھکاریوں کا ایک ٹولہ نمودار ہوا۔ ان میں ہر کیٹگری کے لوگ شامل تھے۔ بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں، اپاہج اور لنگڑے لولے۔

پُرانے بھکاری تو اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ سرخ بتی ایک دو منٹ تک جلتی رہے گی اور ان ایک دو منٹ میں ہی اپنا کام کرنا ہے لیکن وہ بھکاری جن کی اس ٹولے میں نیو انٹری ہوئی تھی، وہ ان سب باتوں سے ابھی ناواقف تھے۔ انہوں نے اِدھر اُدھر گھوم پھر کر اپنے دو منٹ ضائع کر دیے اور کچھ بھی کمائی نہ کر سکے۔ ادھر ٹریفک کی پیلی بتی جلی تو بھکاری نے سڑک کو خالی کرنا شروع کر دیا۔ ابھی دو تین بھکاری سگنل پر ہی تھے جب سبز سگنل روشن ہوا اور گاڑیوں میں دوڑ لگ گئی۔ اب سب بھکاری سڑک سے تھوڑا دُور پیپل کے درخت کے نیچے جمع ہونا شروع ہو گئے اور باری باری اپنی جمع پونجی گننے لگے۔ ابھی وہ گن ہی رہے تھے کہ دوبارہ سے ٹریفک سگنل سرخ ہو گیا اور سب پھر سے گاڑیوں کی طرف دوڑ پڑے۔

پہلے وہ ان کے ساتھ ہی روڈ پر گیا تھا لیکن اس دفعہ وہ اِدھر ہی ٹھہرا رہا کیوں کہ اس کے پاس نہ تو ان جتنا تجربہ تھا اور نہ ہی ابھی مانگنے کا ڈھنگ آتا تھا۔ یہ پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا اور ٹیک لگا کر پتوں کو دیکھنے لگا۔ اس کے والدین کون تھے، کہاں تھے.....؟ وہ نہیں جانتا تھا۔ اس نے جب سے ہوش سنبھالا خود کو یتیم خانے میں پایا۔ وہاں پر سب ہی اس جیسے تھے۔ مرجھائے چہرے، بکھرے بال، پھٹے پُرانے کپڑے، اداس آنکھیں اور ان اداس آنکھوں میں ہزاروں حسرتیں اور شکوے۔ ان میں سے کچھ تو وہ تھے جن کے والدین حادثے کی نذر ہو چکے تھے اور رشتہ داروں نے یہاں لا بٹھایا تھا کہ مفت میں پلتے رہیں گے۔ کچھ بدنصیب ایسے بھی تھے جن کے والدین بھوک، افلاس سے تنگ آ کر ان کو کوڑا کرکٹ کے ڈھیر میں پھینک گئے تھے۔ وہ جس کیٹگری میں آتا تھا، وہ خود نہیں جانتا تھا۔

اسے نہیں پتا تھا کہ اس کے والدین نے اس کا کیا نام رکھا ہے لیکن یہاں پر سب ہی اسے ''جانباز'' کہتے تھے کیوں کہ وہ کسی بھی کام کو کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا تھا۔ وہ ہر کام میں آگے آگے ہوتا۔ اسے دوسروں کی مدد کرنا، خود بھوکا رہ کر دوسروں کو

کھانا کھلانا، اچھا لگتا تھا۔ اس کے دوست اسے کہتے تھے ایک دن آئے گا جب تم بہت بڑے جانباز بنو گے اور ملک وقوم کا نام روشن کرو گے۔ وہ ان کی باتوں پر ہنس دیتا اور کہتا کہ ہم لوگوں کے ٹکڑوں پر پلتے ہیں ہم میں سے اکثر بھیک مانگتے ہیں اور بھکاری کبھی جانباز نہیں بن سکتے لیکن اس کے دوست پھر بھی اسے جانباز ہی کہتے۔ اس کی عمر ابھی صرف نو سال تھی لیکن وہ باتیں بڑوں جیسی کرتا، ایسے لگتا جیسے اس کے اندر کوئی دانشور چھپا بیٹھا ہے۔

وہ جب بھی اکیلا بیٹھتا تو گھنٹوں اپنی تقدیر کے متعلق سوچتا کہ شاید خدا نے میری قسمت میں لکھا ہے لیکن ساتھ ہی وہ اپنی سوچ کی نفی کر دیتا اور کہتا کہ انسان اپنی قسمت خود بناتا ہے۔ وہ دوسروں سے ہٹ کر سوچتا۔ جب لوگ یتیم خانے آ کر کھانا اور کپڑے دے کر جاتے تو اسے بہت بُرا لگتا کیونکہ وہ خود محنت کرنا چاہتا تھا لیکن یہاں پر تو دن ڈھلے کچھ لڑکے نکل پڑتے جو دوسروں کے ساتھ مل کر بھیک مانگتے۔ جانباز ان کے ساتھ جاتا ضرور لیکن کبھی بھی کسی سے بھیک نہ مانگ پایا۔

وہ جب بھی کسی گاڑی کے پاس کھڑا ہوتا تو پتا نہیں کیوں اس کا ضمیر اس کو ملامت کرتا اور کہتا کہ اگر ابھی سے ہی ہاتھ پھیلا دیا تو پھر ساری زندگی یہی کام کرنا پڑے گا۔ اس کے سب دوست بھیک مانگ رہے ہوتے لیکن وہ ٹریفک وارڈن کی طرف دیکھتا۔ اسے ان لوگوں کا یوں دھوپ میں کھڑے ہو کر دوسروں کے لیے نظم و ضبط کا خیال رکھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ اس کی بھی حسرت تھی کہ کبھی وہ بھی آفیسر بن کر قوم کی خدمت کرے گا لیکن بہت ساری حسرتوں کو مجبوریوں کے سوٹن وزنی پہاڑ کے نیچے دبانا پڑتا ہے اور جانباز یہ سب کر رہا تھا۔ وہ ابھی وارڈن آفیسر کو دیکھ ہی رہا تھا جب اسے پیچھے سے آواز پڑی۔ ''اوئے بھکاری!'' بھکاری کا لفظ سنتے ہی اس کے گال غصے سے لال ہو گئے اور اسے ایسا لگا جیسے اسے اس کے منہ پر کسی نے زور کا طمانچہ مار دیا ہو۔ اس نے مڑ کر آواز دینے والے کی طرف دیکھا اور کہا کہ میں بھکاری نہیں، جانباز ہوں۔ اتنا کہہ کر وہ اپنے دوستوں سے پہلے ہی یتیم خانے آ گیا۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ آج کے بعد کبھی بھی ان لوگوں کے ساتھ نہیں جائے گا۔ اس کے گروپ کے لڑکے تو چھوٹے تھے لیکن جانباز کو ان ہٹے کٹے نوجوانوں پر اور ان عورتوں پر جن کے خاوند خود تو ہڈحرامی کرتے ہیں اور انہیں سب کے سامنے رسوا کرتے ہیں، بہت غصہ آتا تھا۔ وہ جب یہ باتیں سوچتا تو بہت پریشان ہو جاتا لیکن پھر اس کو ایک اُمید سی بندھ جاتی کہ خدا ہے ناں اس کی مدد کرنے والا۔ وہ اگرچہ غربت کی حقیر ترین حدوں سے بھی نیچے زندگی گزار رہا تھا لیکن اپنے خدا سے کبھی مایوس نہیں ہوا تھا۔ اس کو خدا پر مکمل بھروسا تھا کیوں کہ جن کا کوئی نہیں ہوتا، ان کا خدا ہوتا ہے۔

وہ اپنی کوشش جاری رکھے ہوئے تھا۔ اسے جو بھی کتاب ملتی اس کا مطالعہ کرتا، سمجھ آتی تب بھی اور سمجھ نہ آتی تب بھی، لیکن وہ خوب محنت کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کاش حکومت کی طرف سے ایسے انتظامات ہو جائیں کہ یتیم خانے کے بچوں اور بھکاریوں کے لیے بھی تعلیم کا سلسلہ شروع ہو جائے۔ اس سے نہ صرف ان بچوں کا مستقبل روشن ہو گا بلکہ ملک بھی مستحکم ہو گا۔ یہ بچے پڑھ لکھ کر ملک وقوم کا نام روشن کریں گے۔ اور بے روزگاری کا خاتمہ ہو گا لیکن وہ صرف ایسی باتیں سوچ ہی سکتا تھا کیوں کہ اس کی آواز اس تک یا اس کے خدا تک محدود تھی۔ یہاں کسی کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اس بے آسرا بچے کی طرف دھیان دیتا۔

جانباز جیسے جیسے بڑا ہوتا جا رہا تھا اس میں اتنی ہی پختگی اور سنجیدگی آتی جا رہی تھی وہ جو بھی پڑھتا یتیم خانے والوں کو اس کا خلاصا بتاتا تھا۔ آہستہ آہستہ سب لوگ اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگے۔ وہ باقاعدہ قرآن و حدیث کا مطالعہ کرتا اور پھر یہ سب باتیں اپنے پاس موجود لوگوں کو بتاتا۔ کچھ ہی عرصہ میں اردگرد کے علاقوں میں یہ بات پھیل گئی کہ یتیم خانے میں ایک لڑکا ہے جو اَن پڑھ ہے لیکن اس کی باتیں پڑھے لکھے لوگوں سے زیادہ دل پر اثر کرتی ہیں۔ جانباز کو اب بہت سے بڑے گھرانوں کے لوگ گھر لے جانے کے لیے تیار ہیں۔ اس کو پڑھانے اور اس کا خرچہ اُٹھانے کے لیے تیار ہیں لیکن جانباز کو آج بھی فکر ہے اپنے حلقۂ یاراں کی، یتیم خانے کے یتیم بچوں کی اور سڑک پر بھیک مانگنے والے بھکاریوں کی۔

کیا کوئی یتیم بچوں اور معصوم بھکاریوں کا ساتھ دے گا......؟ ان کو پڑھائے گا...... سینے سے لگائے گا...... اگر کوئی ہے تو وہ جانباز سے رابطہ کرے۔

☆☆☆

ملک جواد نواز قریشی

اقبال کے شاہین کے روبرو

رات کا پچھلا پہر تھا اور میں اپنے گھر کے وسیع صحن کے درمیان بنے ہوئے تالاب کے کنارے اپنے اردگرد پھیلے تنہائیوں کے حصار میں تنہا کھڑا انسانی زندگی کے آغاز و انجام اور طلوع و غروب پر غور کر رہا تھا کہ ایک قطرہ تالاب کے ساکن پانی میں گرا اور ماحول میں جیسے اک ارتعاش سا پیدا ہو گیا۔ میں نے اوپر دیکھا کہ ایک باریش صورت بزرگ پر نظر پڑی جو میری طرف بڑے انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ جب میرا اضطراب جاتا رہا تو میرے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی آنکھوں میں تیرتا پانی ان کے ذہنی قرب کا صاف پتا دے رہا تھا۔ خیر ہمت کر کے پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ اقبال کی فکر کے وہ شاہین ہیں جنہیں آج کا پاکستانی فراموش کر چکا ہے۔

کہنے لگے زندگی کی کوئی حقیقت نہیں، یہ موت ہی ہے جس نے زندگی کو اہمیت عطا کی ہے۔ خواب اور نیند بھی ایک عارضی سی موت ہے جو انسان کو بصیرت دیتی ہے اور حق و شعور عطا کرتی ہے لیکن یہ غافل انسان سمجھتا نہیں ہے۔ انسانی زندگی تجربات و مشاہدات کا ایک سلسلہ ہے، ہر قدم پر ایک نئی نصیحت اور عبرت ملتی ہے۔ زندگی کے بہت کم تجربات ایسے ہوتے ہیں جو خوش گوار اور مسرتوں سے بھرپور ہوتے ہیں ورنہ اکثر تجربات اپنے اندر تلخیاں لیے ہوتے ہیں اور بعض اوقات یہ تلخیاں زندگی کو ناکام بنا دیتی ہیں۔

میں نے بابا جی سے چند سوالات کیے۔ میرے سوالات اور بابا جی کے جوابات درج ذیل ہیں۔

سوال: نسل نو کی ناکامی کی وجہ کیا ہے؟

جواب: بیٹا! انسان تو یوں ہی پریشان رہتا ہے اس کی پریشانیوں اور ناکامیوں کی تہہ میں دُنیاوی مایوسیاں ہوتی ہیں اگر انسان اس دُنیا کی حقیقت سمجھ لے تو اس کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں رہتی اور یہ پریشانیاں کس کے لیے ہیں، دُنیا کے لیے جس کی کوئی حقیقت نہیں اور فنا جس کا مقدر ہے۔ حیات کی یہ بے چینی، دُنیا کا اضطراب اور نسل نو کی ناکامی اسی وجہ ہے کہ ہمارے سامنے صحیح مقصدِ حیات نہیں ہے۔

سوال: بابا جی مقصدِ حیات کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے؟

جواب: بیٹا! جب سورج چمکنے لگتا ہے تو روشنی ہوتی ہے، دھوپ نکل آتی ہے، تپش ہوتی ہے، حدت ہوتی ہے لیکن یہ دھوپ، یہ تپش آگ نہیں لگاتی، جلاتی نہیں، یہ اس وقت جلاتی ہے جب یہ ایک نقطے پر فوکس ہو گی جب تک ہماری سوچ کے زاویے ایک نقطے پر فوکس

نہیں ہوں گے ہم اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتے۔

سوال: لیکن بعض اوقات مقصدِ حیات کو حاصل کرنے میں ناکامی ہوتی ہے تو اس بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

جواب: بیٹا! کھڑے پانی میں تعفن پیدا ہو جاتا ہے، سڑاند پیدا ہو جاتا ہے لیکن چلتا ہوا پانی بہتر ہوتا ہے اس لیے کہ وہ کسی جگہ رُکتا نہیں۔ بالکل اسی طرح ناکامی بھی ایک نعمت ہے کہ انسان اپنے اندر حوصلہ اور کوشش سے اپنا مقام حاصل کر لے گا۔

سوال: ایک طالب علم کے لیے سب سے زیادہ قیمتی چیز کیا ہے اور سب سے مشکل کام کیا ہے؟

جواب: بیٹا! ہر انسان موت تک طالب علم ہی رہتا ہے اور طالب علم کا سب سے قیمتی سرمایہ اس کا وقت ہوتا ہے اور سب سے مشکل کام اس کے وقت کا استعمال۔

سوال: بابا جی یہ حسن و عشق کیا چیز ہے اور نوجوان نسل کو کیوں تڑپائے ہوئے ہے؟

جواب: بیٹا! آج کا انسان نہ تو حسن کو سمجھ سکا ہے اور نہ ہی عشق کو، عشق تو بڑا مقدس جذبہ ہے جس کی آج کل کوئی توقیر نہیں ہے۔ بیٹا اس دُنیا کی ہر چیز کو زوال ہے لیکن بیٹا حسن کو زوال نہیں آتا۔ ہاں، اس دُنیا کی الگ بات ہے اس میں ہر وہ چیز حسین ہے جسے زوال ہے۔

بیٹا اس کائنات کا حسن انسان ہے اور انسان فطری طور پر حسن کا دلدادہ ہے تو ایک انسان کا دوسرے انسان کو چاہنا کوئی غیر فطری بات نہیں لیکن بیٹے رونا تو اسی بات کا ہے کہ انسان حسن کو سمجھا ہی کب ہے اور رہی بات عشق کی تو عشق بھی بڑا پاکیزہ جذبہ ہے لیکن دُنیا والوں نے اسے بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔ عشق بھی دو طرح کا ہوتا ہے ایک عشق مجازی اور دوسرا عشق حقیقی، کسی ایک شخص کے سامنے اپنی انا کو پامال کر دینے کا نام عشق مجازی ہے اور سب کے سامنے اپنی انا کو پامال کر دینے کا نام عشق حقیقی ہے معاملہ جو بھی ہو، معاملہ ہر حال میں انا کی پامالی کا ہے لیکن آج کا انسان انا پرست ہے۔ وہ کیا جانے ان جذبوں کو وہ تو بس اپنی انا کو، اپنے نام کو، اپنی بے حسی کو، چھپانے کے لیے اس میدان میں کود پڑتا ہے۔

سوال: بابا جی! کیا آج کے دور میں محبت لاحاصل ہے؟

جواب: دیکھو بیٹا! محبت گرائمر کی کتاب کا نام نہیں، یہ ردیف اور قافیہ کی قیود سے آزاد بحرِ بیکراں ہے جس میں سفر کرنے والے لہجے یا زبانوں کے پابند نہیں ہوتے یہ تو انسان کے اندر کا اندر ہے۔ بیٹا وقت سے پہلے کسی بھی چیز کی طلب اسے لاحاصل بنا دیتی ہے۔

سوال: لیکن بابا جی یہ بات تو ہے کہ تقدیر کے آگے تدبیر نہیں چلتی؟

جواب: میرے اس سوال پر بابا جی کی آنکھوں میں جیسے بلا کی دہشت آ گئی ہو۔ بڑے جلال سے بولے کہ تم لوگ سمجھتے کیوں نہیں کہ تقدیر تم خود بناتے ہو۔ جب تمہارے سامنے سب کچھ موجود ہے، جب تم سب کچھ جانتے ہو تو ایسے فعل کیوں کرتے ہو جو تمہارے لیے عذاب کا باعث بنیں اور تکلیفیں اُٹھانی پڑیں۔

سوال: بابا جی! ہم حقیقت سے دُور کیوں بھاگتے ہیں؟

جواب: تم لوگ حقیقت سے اس لیے دُور بھاگتے ہو کہ تمہارے اعمال حقیقت کی نفی ہوتے ہیں اور تمہاری سوچ کو زنگ لگ چکا ہے، تمہارا اندازِ فکر گھٹیا ہو چکا ہے، تم لوگ جوانی کو جوانی اور بڑھاپے کو بڑھاپا اس لیے سمجھتے ہو کہ یہ عمر کا تقاضا ہے لیکن یہ غلط ہے، جوانی اور بڑھاپا تو اندازِ فکر کا نام ہے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ایک انسان 20 سال کی عمر میں بوڑھا اور ایک شخص 60 سال کی عمر میں جوان ہو کیوں کہ یہ ہماری سوچ ہی تو ہے جو ہم سے ایسے اعمال کراتی ہے جو حقیقت سے دُوری کا باعث بنے یا حقیقت کے قریب تر ہوں۔

سوال: ایک ملک کی تعمیر میں طالب علم کی کیا ذمہ داری ہونی چاہیے؟

جواب: ایک طالب علم کے طور پر ہماری سب سے اہم ذمہ داری یہ ہونی چاہیے کہ دل لگا کر اپنی پڑھائی کی طرف توجہ دیں اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہم کتابیں پاس کرنے کا نہیں، علم حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھیں۔ اس طرح سے ہم آگے چل کر ملک و قوم کی بہتر طریقے سے خدمت کر سکتے ہیں۔ ☆☆☆

(بقیہ: آپ بھی لکھیے)

دیا۔ جنید کو بہت افسوس ہوا کہ اس نے اعتدال سے کام نہ لے کر اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مار دی ہے۔ جنید نے مما اور پاپا سے معافی مانگی اور اپنے دوست احسن سے بُرے برتاؤ پر معذرت کی اور آئندہ ہمیشہ کام وقت پر کرنے کی ٹھان لی۔ یوں وقت نے اپنی قدر آپ منوا لی۔ اگر آج وقت کی قدر کی جائے گی تو کل کو آنے والا وقت ہماری قدر ضرور کرے گا اور یہی قدرت کا قانون اور ضابطہ ہے۔ (پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

ایڈیٹر کی ڈاک

مدیرہ تعلیم وتربیت، السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

جناب عالی! آپ اور تعلیم و تربیت سے وابستہ ہر شخص کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ سب پر اپنی رحمت فرمائے۔ 14 اگست کی آمد آمد ہے، لہٰذا آپ سب کو جشن آزادی بہت بہت مبارک ہو۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ وطن عزیز کی اس پاک سرزمین کو ہمیشہ آباد و شاد رکھے اور دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھے۔ نہایت مؤدبانہ گزارش ہے کہ کوپن کے لیے آپ الگ سے ایک صفحہ مختص کر دیں، جس کے دوسری جانب کوئی ایسی قیمتی لکھائی نہ ہو جس کے کٹ جانے سے سارے رسالے کی خوب صورتی میں کمی آ جائے۔ اُمید کرتا ہوں کہ بندہ ناچیز کی اس ناقص تجویز پر غور کیا جائے گا۔

(محمد احمد خان، غوری)

☆ جناب غوری صاحب! ہماری کوشش ہوتی ہے کہ کوپن کی پشت پر کوئی کھیل وغیرہ دے دیں۔ خط لکھنے اور دعاؤں کے لیے آپ کا شکریہ!

ایڈیٹر صاحبہ! آپ کا رسالہ بہت اچھا ہے۔ میں آپ کا ماہنامہ تعلیم و تربیت بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ میں دس سال سے آپ کا رسالہ پڑھ رہی ہوں، اس لیے میں نے سوچا کہ اس پیارے سے رسالے کے لیے کچھ لکھوں۔ محترمہ ایڈیٹر صاحبہ! میں آپ کے رسالے میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں۔ آپ سے گزارش ہے کہ سلسلہ مختصر مختصر میں میری تحریر ''دوست'' کو اپنے رسالے میں جگہ دیں تاکہ میں آئندہ بھی کچھ لکھ سکوں۔ میں آپ کی بے حد شکر گزار ہوں گی، اگر آپ اس کو اگست کے شمارے میں شائع کر دیں گے۔ نیز تعلیم و تربیت کی ساری ٹیم کو میری طرف سے سلام۔ (ندا افتخار، چشتیاں)

اُمید ہے کہ آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ جولائی کا شمارہ ٹاپ پر تھا۔ ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک تھی مگر مچھلی کا کانٹا ٹاپ پر تھی۔

میں کافی عرصہ غیر حاضر رہی کیوں کہ میرے میٹرک کے امتحانات ہونے والے تھے۔ پلیز! میرے لیے دعا کریں کہ میرے 90 فیصد تک نمبر آ جائیں۔ میرے نہم میں 458 نمبر ہیں۔ اُمید ہے میرا خط ردی کی ٹوکری کی نذر نہیں ہوگا اور میرا خط ضرور شائع کیجیے گا تاکہ جتنے بھی لوگ میرا خط پڑھیں، وہ میرے لیے دعا کریں۔

(عشرہ امین، لاہور)

☆ اللہ تعالیٰ آپ کو کام یاب کرے۔ خط لکھنے کا شکریہ!

آپ کیسی ہیں؟ اُمید ہے ٹھیک ہوں گے۔ میں تعلیم و تربیت بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ میری امی بھی تعلیم و تربیت کا ایک اہم حصہ رہی ہیں۔ وہ بھی یہ رسالہ بہت شوق سے پڑھتی ہیں اور اپنے زمانے میں بہت سی تحریریں بھی بھیج چکی ہیں اور کئی انعامات بھی وصول کر چکی ہیں۔ محترمہ ایڈیٹر صاحبہ! میں تعلیم و تربیت میں ایک انتہائی دل چسپ کہانی ''ابوالقاسم کے جوتے''، ''کمال کی باتیں'' اور ایک لطیفہ بھیج رہی ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ کو میری تمام تحریریں ضرور پسند آئیں گی۔ مہربانی فرما کر ضرور شائع کیجیے گا۔

(قریشہ فاطمہ فاروقی، رحیم یار خان)

☆ پسندیدگی کا شکریہ! والدہ صاحبہ کو میری طرف سے سلام پہنچائیں۔ تحریریں معیاری ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔

ڈیئر آپی! اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گی اور آپ کی عید بھی اچھی گزری ہو گی۔ 11 جولائی 2016ء کو مجھے میرا میگزین وصول ہوا۔ پڑھ کر میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ اس بار کا شمارہ ٹاپ پر تھا لیکن افسوس میرا میگزین تعلیم و تربیت تاریخ نکلنے کے بعد ہمارے شہر میں آیا۔ تعلیم و تربیت ہر ماہ ہمارے شہر کلورکوٹ میں بہت تاخیر سے پہنچتا ہے جس کی وجہ سے میں اپنی چیزیں تاریخ نکلنے کے بعد بھیج رہی ہوں۔ ہمارے شہر میں تعلیم و تربیت کی سروس کو بہتر بنایا جائے۔ میری ایک چھوٹی سی خواہش ہے جو آپ پوری کریں گے نا۔ مہربانی فرما کر میرے خط کو ردی کی ٹوکری سے بچا لیں اور میرا نام ضرور انعامی سلسلوں میں شائع کریں۔ آپ کی شکر گزار ہوں گی اور میرے نویں جماعت کے امتحان کے نتیجے کی دعا کیجیے گا۔ میری کی کوتاہی کو درگزر فرمائیں۔ (بشریٰ حسینی، کلورکوٹ)

☆ ہماری کوشش ہے کہ آپ سب کو میگزین وقت پر ملے۔ آپ کے امتحانات کے لیے بہت سی دعائیں۔

اُمید ہے، آپ خیریت سے ہوں گی۔ جولائی کا شمارہ عید سے دو دن قبل موصول ہوا۔ سرورق بے حد پیارا تھا۔ عبدالرشید فاروقی بھائی

کی کہانی عید کی خوشیاں بہت پسند آئی۔ علی اکمل کی تحریر دھوکے باز نے بہت ہنسایا۔ محمد فاروق دانش کی کہانی میں بے حد سسپنس تھا۔ اصل مفلس میں مریم اعجاز نے بہت عمدہ سبق دیا۔ آپی ایک کہانی بھی بھیج رہا ہوں۔ پڑھ کر بتایئے گا کیسی ہے۔ اگر اچھی لگے تو قریبی شمارے میں شائع کر دیجیے گا۔ (غلام یٰسین نوناری، مظفر گڑھ)

میری طرف سے تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم کو دلی عید مبارک قبول ہو۔ ہم نے اداریہ سے لے کر مچھلی کا کانٹا تک سارا ہی رسالہ پڑھا۔ بہت ہی مزا آیا۔ جولائی کے شمارے میں میری کوئی بھی تحریر شامل نہیں کی۔ کیا کوئی ہم سے ناراضگی ہے؟ آپ ہم سے ایسا تو نہ کریں۔ اب اجازت دیں۔ (غزالہ حبیب، تاندلیانوالہ)

☆ آپ سے ہم کیسے ناراض ہو سکتے ہیں۔ تحریر آئندہ شماروں میں شائع کریں گے۔ تھوڑا سا انتظار کیجیے۔

ایڈیٹر صاحب! ابھی ابھی تعلیم و تربیت موصول ہوا یعنی 3 جولائی کو اور ہم بہن بھائی سر جوڑ کر بیٹھ گئے یعنی حل ڈھونڈنے۔ عنوان سوچنے لگے۔ سوچ بچار کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ تعلیم و تربیت کا شکریہ! اس نے ہمیں بہت مصروف رکھا ہوا ہے۔ (اسد عبداللہ، ملتان)

میرا نام راحم عمران ہے۔ میں جماعت سوئم میں پڑھتا ہوں اور میری عمر 8 سال ہے۔ میں نے جولائی کا موضوع ''بارش کا ایک دن'' پر تصویر بنائی ہے لیکن جون کے رسالے میں جولائی کے موضوع کا کوپن نہیں ہے۔ ہم لوگوں نے دکانوں پر بھی پتا کیا مگر وہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ رسالہ ابھی تھوڑے دنوں تک آئے گا۔ جولائی کے موضوع کی آخری تاریخ 8 جولائی ہے اور ہمیں رسالہ نہیں مل رہا۔ ہم نے جون والے رسالے کے کوپن پر نام اور پتا لکھ دیا ہے، برائے مہربانی اسے قبول کر لیجیے گا۔ آپ کا بہت شکریہ!

(راحم عمران، بہاول پور)

آپ کو اور تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم کو گزشتہ عید مبارک ہو۔ پورا تعلیم و تربیت بہت ہی خوب صورت تھا۔ تمام کہانیاں ٹاپ پر تھیں۔ کھڑکھاند گروپ کیوں بند کر دیا گیا ہے؟ ناول بہت ہی اچھا ہے۔ ضرب المثل بھی بہت دل چسپ کہانی ہے۔ میں ہر ماہ کھوج لگایئے میں حصہ لیتی ہوں لیکن کبھی انعام نہیں نکلا۔ اس بار بھی جواب بھیج رہی ہوں، اُمید ہے ضرور انعام نکلے گا۔ میری یہ خواہش ہے کہ کوپن کے پچھلے صفحے پر ادھجل خاکے کا صفحہ شائع کیا کریں تاکہ کوئی کہانی والا صفحہ نہ کٹ سکے۔ میرا خط بیشک شائع نہ کریں لیکن میری یہ خواہش ضرور نوٹ کر لیں۔ آئندہ ملاقات ہو گی۔ (کشف جاوید، فیصل آباد)

☆ خط لکھنے اور میگزین کی تعریف کرنے کا بہت شکریہ! انعام کے لیے قرعہ اندازی کی جاتی ہے، لہٰذا انتظار کی زحمت تو اُٹھانی پڑے گی۔

اُمید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ مجھے تعلیم و تربیت پڑھتے ہوئے تقریباً ایک سال ہو گیا ہے اور میں دوسری دفعہ خط لکھ رہا ہوں۔ پلیز! میرے خط کو ردی کی ٹوکری سے بچایئے اور میرے خط کو شائع کیجیے۔ اس شمارے میں ساری کہانیاں پُرلطف تھیں مگر ایک چیز کی کمی تھی اور وہ ہے کھوج لگایئے میں حصہ لینے والے بچوں کے نام۔ میری دعا ہے کہ تعلیم و تربیت ترقی کی منازل طے کرتا رہے، آمین مارچ میں میری زندگی کے مقاصد میں اپنی تصویر، آیئے مسکرایئے اور میری بیاض سے کے لیے اشعار بھیجے تھے اور جون میں کچھ احادیث اور آیئے مسکرایئے بھیجے تھے جس میں سے میری زندگی کے مقاصد مئی میں شائع ہو گیا ہے اور باقی کچھ شائع نہیں ہوا۔ مہربانی فرما کر اس کو بھی شائع کیجیے۔ کھوج لگایئے میں بھی حصہ لیتا ہوں۔

پھول ہے گلاب کا خوشبو تو لیا کرو
خط ہے شاہین کا شائع تو کیا کرو

(محمد سفیان شاہین، لودھراں)

☆ دوسری تحریروں کے لیے آپ انتظار کیجیے۔ ضرور شائع ہوں گی۔

اُمید ہے تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم خیروعافیت سے ہو گی۔ تعلیم و تربیت کا جولائی کا ایڈیشن بہت پیارا تھا۔ میں نے اسے بہت پسند کیا۔ اس نے مجھ کو جوشیلا کر دیا۔ تعلیم و تربیت کی خاص بات اس کی جوش بھری معلومات ہیں۔ تعلیم و تربیت تو مجھے بہت پسند ہے۔ میں نے پچھلے ماہ ایک خط لکھا تھا۔ میں نے اس میں لکھا تھا کہ میں خط شائع کرنے کے لیے ضد نہیں کروں گا اور آپ نے میری عاجزی کا فائدہ اُٹھا لیا اور میرا خط شائع نہیں کیا، حتیٰ کہ نام تک شائع نہیں کیا۔ مجھے خط کے شائع کرنے پر افسوس اس لیے ہوا کیوں کہ میں آپ سے، آپ کے جواب کا طالب تھا۔ مہربانی فرما کر میری شکایت کو دُور کر دیں۔ ایک اور شکوہ ہے اس کے علاوہ، وہ یہ کہ جب ہمیں کوپن کاٹنے پڑتے ہیں تو اس کے اگلے صفحے کا معلوماتی حصہ بھی کٹ جاتا ہے۔ اس مسئلے کو بھی مہربانی کر کے دُور کیجیے۔ اللہ حافظ! (مرزا احسن، فیصل آباد)

دماغ لڑاؤ

داؤدی علمی آزمائش

درج ذیل دیئے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ قرآن پاک کی ابتداء کس حرف سے ہوتی ہے؟

i۔ ب　ii۔ پ　iii۔ الف

2۔ پاکستان کا برمنگھم کس شہر کو کہا جاتا ہے؟

i۔ گجرات　ii۔ لاہور　iii۔ سیال کوٹ

3۔ راول بند کس دریا پر باندھا گیا ہے؟

i۔ دریائے کابل　ii۔ دریائے گورنگ　iii۔ دریائے جہلم

4۔ پاکستان اقوام متحدہ کا ممبر کب بنا تھا؟

i۔ 30 ستمبر 1947ء　ii۔ 30 اکتوبر 1947ء　iii۔ 30 نومبر 1947ء

5۔ پاکستان کا پہلا ڈاک ٹکٹ کب جاری ہوا؟

i۔ 9 جون 1956ء　ii۔ 9 جولائی 1956ء　iii۔ 9 اگست 1956ء

6۔ قائداعظم کتنے عرصے تک پاکستان کے گورنر جنرل رہے؟

i۔ 4 سال　ii۔ 3 سال　iii۔ 1 سال

7۔ پاکستان کا معیاری وقت کب مقرر کیا گیا؟

i۔ 1951ء　ii۔ 1952ء　iii۔ 1953ء

8۔ پاکستان کا معیاری وقت کس نے تجویز کیا؟

i۔ پروفیسر نور احمد　ii۔ پروفیسر محمد انور　iii۔ پروفیسر نادر

9۔ قومی ترانہ بجنے میں کتنا وقت لگتا ہے؟

i۔ 1 منٹ 5 سیکنڈ　ii۔ 1 منٹ 10 سیکنڈ　iii۔ 1 منٹ 20 سیکنڈ

10۔ پاکستان کا پرچم سب سے پہلے کس ملک میں لہرایا گیا؟

i۔ ایران　ii۔ فرانس　iii۔ مصر

جوابات علمی آزمائش جولائی 2016ء

1- بڑی مچھلی 2- مینار جیکل انجینئرنگ 3- تھالر 4- کاخ امراء کے در و دیوار ہلا دو 5- نخشبہ 6- ریڈ کراس کا پرانا نام 7- کنعان 8- لارڈ اسکاؤٹ 9- پہلی جھنڈی 10- بیروت

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیئے جا رہے ہیں۔

☆ احمد عبداللہ، ملتان　(150 روپے کی کتب)

☆ محمد احمد خان غوری، بہاول پور　(100 روپے کی کتب)

☆ محمد حارث، شیخوپورہ　(90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:

شاہ زیب احمد، راول پنڈی۔ عدن سجاد، جھنگ۔ ملک محمد احسن، راول پنڈی۔ احمد عبداللہ، ملتان۔ سردار محمد عثمان، لاہور۔ حذیفہ اویس، فیصل آباد۔ محمد احمد خان غوری، جویریہ غوری، بہاول پور۔ مرزا محمد احمد، فیصل آباد۔ نمرہ مہک، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ حمزہ نعمان، فیصل آباد۔ مشعال آصف، لاہور۔ علی طاہر، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ اعیان جاوید، حیدر آباد۔ محمد سلیمان بٹ، ساہی وال۔ عثمان حیدر، پشاور۔ عروسہ خالد، اٹک۔ مریم نواز، فیصل آباد۔ ندیم بیگ، نوشہرہ۔ نورالامین، فیصل آباد۔ بشریٰ بتول، سیال کوٹ۔ رانا عبداللہ، ملتان۔ سعود الحسن، خانیوال۔ شہزاد حیدر، کراچی۔ ثوبیہ سلیم، لاہور۔ ایاز خان، پشاور۔ جلال عابد بٹ، دینہ۔ ظل ہما، حیدر آباد۔ عبدالغفور حیدر، کراچی۔ نورین اشفاق، رحیم یار خان۔ اقتیاز عالم، واہ کینٹ۔ لائبہ بشیر، قلعہ دیدار سنگھ۔ محمد زبیر اسلم، لاہور۔ عائشہ نذیر، کراچی۔ نسرین بتول، ملتان۔ محمد یٰسین قمر، خانیوال۔ افتخار بھٹی، جہلم۔ راجہ محمد اسلم، راول پنڈی۔ احسن رؤف، لاہور کینٹ۔ عفت بتول، راول پنڈی۔ راجہ ریاض حسین، واہ کینٹ۔ ام کلثوم، خانیوال۔ عامر سہیل، لاہور۔ عمران فاروق، اوکاڑہ۔ عمیرہ بشیر، قصور۔ سلمان رشید، ایبٹ آباد۔ عائشہ نوید، ملتان۔ نور فاطمہ، خانیوال۔ محمد احسان، راول پنڈی۔ اریبہ محمود، گوجرانوالہ۔ زویا جاوید، گجرات۔ علینا مشعل، قصور۔ احمد یار خان، خانیوال۔ نور فاطمہ، حیدر آباد۔ احسن اقبال، کراچی۔ بینش آفاق، قصور۔ محمد دانیال اصغر، چنیوٹ۔ آصف باجوہ، لاہور۔ نیلم پری، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ مہر محمد اسلم، ایبٹ آباد۔ خدیجہ منیر، پشاور۔ عاصم جاوید، سیال کوٹ۔ اسامہ جاوید، ڈیرہ اسماعیل خان۔ زینب اظہر، جھنگ۔ مریم بشیر، شیخوپورہ۔ ہمایوں ارشد، راول پنڈی۔ آمنہ بی بی، بہاول پور۔ عاصم طفیل، کراچی۔ امان اللہ خان، میرپور آزاد کشمیر۔ عائشہ مجید، بورے والا۔ زینب اظہر، ڈیرہ اسماعیل خان۔ انیتا اقبال، سرگودھا۔

چکوال پیارے وطن کے پیارے شہر

رانا محمد شاہد

چکوال...... پنجاب کا اہم ترین ضلع ہے۔ اس کی اہم تحصیلوں میں تلہ گنگ، کلرکہار اور چواسیدن شاہ شامل ہیں۔ چکوال کا پُرانا نام "چوہدری چکو خان" جو کہ منہاس قبیلے کے سردار تھے، کے نام پر رکھا گیا تھا۔ چکوال کو 1985ء میں ضلع کا درجہ دیا گیا۔ تلہ گنگ ضلع چکوال کی ایک انتہائی اہم تحصیل ہے۔ اس کے نام کے ساتھ دو الفاظ تلہ اور گنگ بھی ایک تاریخ رکھتے ہیں۔ تلہ کا مطلب ہے نچلے حصے والی زمین اور گنگ ہندی قوم کا نام ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے یہاں گنگ قوم آباد تھی اور یہ علاقہ باقی علاقوں سے نچلی سطح پر تھا۔ اس لیے ان لوگوں کو تلہ گنگ کے باعث شناخت کیا جاتا تھا۔ تحصیل تلہ گنگ ملک کی سب سے بڑی شاہراہ موٹر وے سے 30 کلو میٹر دور واقع ہے جب کہ ضلع چکوال سے 45 کلو میٹر دور ہے۔ یہاں کے لوگ زیادہ تر پنجابی بولتے ہیں۔

چکوال کے جنوبی حصے پر زیادہ تر پہاڑی سلسلہ واقع ہے اور سطح سمندر سے 3701 فٹ کی اونچائی پر یہ جب کہ شمال میں زیادہ حصہ دریائے سوہان کے قریب واقع ہے۔ چکوال میں پہاڑی سلسلہ کے ساتھ ساتھ بارانی علاقہ بھی وسیع پیمانے پر ہے۔ یہاں کی کاشت کاری میں بارش کا بہت عمل دخل ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے یہاں ہندو، سکھ اور عیسائی قومیں آباد تھیں۔ ان میں اکثریت سکھوں کی تھی۔ پاکستان کے قیام کے بعد یہ قومیں بھارت ہجرت کر گئیں جب کہ بھارت سے آنے والے مسلمان یہاں آباد ہو گئے۔

چکوال اچھی نسل کے بیلوں اور گھوڑوں کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔ مشہور مصنف کرنل محمد خان کا تعلق چکوال سے تھا۔ پاکستانی فوج سے تعلق رکھنے والے کافی جوان اس شہر سے تعلق رکھتے ہیں۔ معروف بریگیڈیئر گلزار احمد کا تعلق کٹاس کے علاقے سے ہے جو ضلع چکوال میں ہے۔ وہ 1908ء میں پیدا ہوئے اور 1998ء میں ان کا انتقال ہوا۔ وہ نہ صرف پاک فوج کے اعلیٰ افسر تھے بلکہ انہوں نے بہت سی کتب بھی تصنیف کیں۔ ان میں غزواتِ اسلام، دفاع پاکستان کی لازوال داستان، جہاد قرآن و سنت کی روشنی میں، عسکری قیادت اور تذکرۂ ایام (خودنوشت) قابل ذکر ہیں۔ چکوال میں خواتین کے لیے الگ سے کوئی اسپتال نہیں ہے، تاہم ایک گورنمنٹ اسپتال موجود ہے۔ کٹاس میں لڑکوں کا انٹر کالج 1972ء میں قائم ہوا۔ کٹاس سے کلر کہار روڈ پر آئیں تو یہاں حکومت پاکستان نے سیمنٹ تیار کرنے کی دو بہت بڑی فیکٹریاں قائم کیں۔

یونیسکو کا عالمی ورثہ...... کٹاس راج:

پاکستان مختلف تہذیبوں و مذاہب کے ماننے والوں کا وطن ہے۔ اس سرزمین پر کبھی سکھوں نے حکومت کی اور کبھی ہندوؤں اور انگریزوں نے، سب نے اس خطہ پر اپنے اثرات و آثار چھوڑے ہیں۔ ان کی تعمیر کردہ عمارات میں ان کی تہذیب کا نمایاں اثر دکھائی دیتا ہے۔ ضلع چکوال سے تقریباً 40 کلو میٹر کے فاصلے پر کوہستانِ نمک کے علاقے میں کٹاس راج نامی مندر کے آثار ملتے ہیں۔ یہ مندر کلر کہار سے 28 کلو میٹر اور چوآسیدن شاہ سے 3 کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ کوہستان نمک میں واقع ہندوؤں کی یہ یادگار سیاحوں کی توجہ کا خاص مرکز رہی ہے۔ سیاحوں کی اس دل چسپی کی وجہ سے یونیسکو نے اس مندر کو عالمی ورثے کا درجہ دے رکھا ہے۔ ''کٹاس'' سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے۔ ''برستی ہوئی آنکھیں۔'' ہندوؤں کے مطابق کٹاس راج ایک مقدس جگہ ہے اور مہابھارت میں اس کا ذکر بھی موجود ہے۔ یہ بھی روایت مشہور ہے کہ پانچ پنڈتوں نے اپنی 14 سالہ جلاوطنی کے دور میں چار برس تک یہاں قیام کیا تھا۔

مؤرخین کا کہنا ہے کہ ہندو شاہی خاندان محمود غزنوی کے اقتدار میں آنے کے بعد افغانستان سے فرار ہو کر پوٹھوہار کی سرزمین پر آ کر آباد ہوا اور پھر یہاں اپنی ضرورت کے مطابق مندر تعمیر کروائے۔ یہاں ایک مشہور ''مہا شیو راتری'' کا تہوار بھی منایا جاتا ہے۔ مہاشیو راتری کے معنی ہیں۔ ''شیوا کی رات!'' ''شیوا'' ہندو دھرم میں ایک بڑا دیوتا مانا جاتا ہے۔ ہندو اسے فنا کرنے والا اور دوبارہ پیدا کرنے والا دیوتا سمجھتے ہیں۔ اس حوالے سے تین دل چسپ باتیں مشہور ہیں۔ ہندو اس تہوار کی وجہ تین وجوہات بتاتے ہیں۔ پہلی، شیوا دیوتا جس کی کوئی شکل نہیں، وہ آدھی رات کے وقت آیا تھا۔ دوسرا، اس نے پاروتی سے شادی کی تھی، جو انسانی روح کے دیوتا سے ملنے کی علامت ہے۔ تیسری وجہ، شیوا دیوتا نے ایک خطرناک زہر پی کر اپنی گردن میں روک لیا تھا۔ ہندوؤں کے مطابق زہر کا ایک قطرہ بھی اگر دیوتا کے پیٹ، جو کائنات کی علامت ہے، تک پہنچ جاتا تو دنیا ختم ہو جاتی۔

اس لیے مہاشیو راتری کی رات کو دنیا کو بچانے کے لیے شیوا دیوتا کا شکریہ ادا کرنے کے لیے منایا جاتا ہے۔ ہندو اپنے عقیدے کے مطابق اس رات بھوکے رہتے ہیں بلکہ بعض تو پانی پینا بھی اچھا نہیں سمجھتے۔ رات بھر شیوا دیوتا کی پوجا جاری رہتی ہے اور لوگ یہاں موجود تالاب میں نہاتے ہیں۔ ہندوؤں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جو شخص رات بھر شیوا دیوتا کو پکارتا ہے، اس کے گناہ دھل جاتے ہیں۔ کٹاس راج کے متعلق اور کئی روایات بھی مشہور ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ مندر کے ساتھ موجود تالاب درحقیقت شیوا دیوتا کے وہ آنسو ہیں جو انہوں نے اپنی بیوی کی موت پر بہائے تھے۔ ان آنسوؤں سے ایک تالاب کٹاس اور دوسرا پشکارا بنا، جو اجمیر میں ہے۔

ایک روایت یہ ہے کہ شیوا دیوتا اپنی بیوی کی موت پر نہیں بلکہ اپنے پسندیدہ گھوڑے کی موت پر اس قدر روئے کہ ان کے آنسوؤں سے دو تالاب وجود میں آ گئے۔ کٹاس میں اس وقت سات مندر ہیں۔ 1947ء میں آزادی کے بعد مقامی ہندوؤں کی اچھی خاصی تعداد بھارت چلی گئی اور یوں مندر میں پوجا کرنے والوں کی تعداد بہت کم رہ گئی۔ بت کدوں کے اس کمپلیکس یعنی کٹاس راج کی حالت بھی خراب تر ہوتی چلی گئی اور تاریخی نوعیت کی اکثر عماراتیں کھنڈرات میں بدل گئیں۔ تاہم 2007ء میں حکومت پاکستان نے 51 ملین روپے کی لاگت سے کٹاس راج کو اس کی اصل حالت میں بحال کیا۔ یوں ان تاریخی مندروں کو محفوظ بنانے کے لیے اقدامات کیے گئے۔ سینکڑوں ہندو ہر سال یہاں کی پوجا و زیارت کے لیے آتے ہیں۔

کلر کہار:

کلر کہار ضلع چکوال کا قدیم تاریخی قصبہ ہے جو چکوال سے سرگودھا جانے والی سڑک پر چکوال سے 18 میل اور چوآسیدن شاہ سے دس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ 712ء میں یہ علاقہ ریاست کشمیر کے زیر انتظام تھا اور یہاں کے مختار کار حسیم بن سامہ شامی نے اسے اپنا انتظامی مرکز بنایا۔ یہاں چنار کے درخت لگائے گئے اور مسجد و حویلی تعمیر کرائیں۔ 1519ء میں یہاں سے مغل بادشاہ ظہیرالدین بابر کا گزر ہوا تو اس کے حکم پر ایک باغ بنایا گیا جسے بابر نے ''باغ صفا'' کا نام دیا۔ یہ باغ آج بھی موجود ہے۔ اس کا رقبہ 11 کنال اور 5 مرلے ہے۔ لوکاٹ، آڑو اور خوبانی کے درخت لگے ہیں۔ گلاب بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں جس کا عرق نہایت

(بقیہ: صفحہ نمبر 39)

قندِ مکرر

سید نظر زیدی

آزادی کی مشعل

سیّد نوازش علی کو تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔ سر میں شدید درد بھی تھا۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے ماتھا دباتے ہوئے ٹائم پیس پر نظر ڈالی۔ سوئیاں دو بج کر پندرہ منٹ پر تھیں۔ وہ کراہتے ہوئے اُٹھ کر بیٹھ گئے اور پیروں سے جوتیاں سیدھی کرنے لگے۔

''یہ آپ کہاں چلے؟'' ان کی بیوی نے بچے کا کرتا اور سوئی دھاگا ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

''ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ پارٹی کا انتظام بھی کرنا ہے۔ صاحب نے آج اپنے کچھ دوستوں کو بلایا ہے۔'' سیّد صاحب نے ہتھیلیوں سے آنکھوں کا پانی پونچھا اور کھڑے ہو گئے۔

''خاک ڈالیں اس موئی پارٹی پر۔ بخار سے پھنک رہے ہیں۔ اس حالت میں کیسے کام کریں گے؟ کہلوا دیجیے میں بیمار ہوں۔'' بیوی نے جل بھن کر کہا۔ خاوند کی تکلیف کی وجہ سے وہ بہت پریشان تھیں۔ وہ انہیں روکنے کے لیے کچھ اور کہنا چاہتی تھیں کہ کوارٹر کے باہر سے میم کی تیز آواز آئی۔ ''بیرا! ویل! کدھر مر گیا تم؟ بولا آج بڑا بڑا صاحب لوگ آنا مانگتا۔'' میم کی آواز سن کر سیّد صاحب جوتیاں گھسیٹتے ہوئے جلدی سے باہر آ گئے اور ادب سے بولے۔ ''میم صاحب، بس میں آ ہی رہا تھا۔ آپ تشریف لے چلیے۔ نماز پڑھ کر ابھی حاضر ہوتا ہے۔''

''ویل! تم کام چور بہانہ کرتا۔ چلو ابھی امارا ساتھ، ابھی!'' میم نے تقریباً چلّاتے ہوئے کہا۔ سیّد صاحب نے کچھ اور کہنا مناسب نہ سمجھا، سر جھکا کر اس کے ساتھ چل دیئے۔ سوچا وقت نکال کر وہیں نماز پڑھ لوں گا۔

سیّد صاحب کی بیوی دروازے کی اوٹ سے یہ ساری باتیں سن رہی تھیں۔ میم نے جب ان کے شوہر کو کام چور اور بہانے باز کہا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ان کا دل چاہتا تھا سیّد صاحب آگے بڑھ کر اس چڑیل کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کریں، لیکن جب وہ سر جھکا کر اس کے ساتھ جانے لگے تو وہ نڈھال ہو کر پلٹیں اور چارپائی پر گر کر سسکیاں بھرنے لگیں۔ انہیں اپنے اور اپنے شوہر کے خاندانی مرتبے کا حال پوری طرح معلوم تھا۔ ہندوستان میں انگریزوں کے آنے سے پہلے ان کے بزرگ اودھ کی اسلامی سلطنت میں بہت بڑے عہدے دار تھے۔ ان کی بہت بڑی حویلی تھی جس کے دروازے پر نوبت بجا کرتی تھی۔

انگریزوں نے اودھ پر قبضہ کرنے کے لیے حملہ کیا تو دوسرے غیرت مند مسلمانوں کی طرح ان کے بزرگ بھی تلواریں

جُوت کر انگریزوں کے مقابلے پر ڈٹ گئے اور بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اودھ کی سلطنت مٹ گئی اور نواب واجد علی شاہ اختر کو قید کر کے مٹیا برج کلکتہ بھیج دیا گیا۔

لڑائی ختم ہونے کے بعد بہ ظاہر امن امان قائم ہو گیا لیکن انگریز حاکموں نے ان خاندانوں کو معاف نہ کیا، جنہوں نے ان کا مقابلہ کیا تھا اور ان خاندانوں میں سیّد صاحب کا خاندان بھی تھا۔ انگریزوں نے ان کی شان دار حویلی اور ساری جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ بچے کھچے لوگ مشکل سے اپنی جانیں بچانے میں کام یاب ہوئے اور ہوتے ہوتے اس حالت کو پہنچ گئے کہ سیّد نوازش علی انگریزوں کی بیراگیری کر رہے تھے اور اس قدر بے بس تھے کہ میم اور صاحب کی کڑوی کسیلی باتیں چپ چاپ سن لیتے تھے۔

میم کی طرح سیّد صاحب کو صاحب نے بھی ڈانٹا۔ وہ غصے بھری آواز میں بولا۔ ''ویل بیرا! ٹم کو مالوم، آج بڑا بڑا صاحب لوگ ادھر آنا مانگتا۔ لیکن ٹم آج بھی کام چوری کرنا مانگتا۔ ہم ٹم کو برخاس کرنا مانگتا۔ کوارٹر کھالی کرو اور ادھر سے بھاگ جاؤ۔''

سیّد نوازش علی کو یوں لگا کہ ان کے اندر اچانک ایک ایسا نوازش علی جاگ اُٹھا ہے جس کے ہاتھ میں تلوار ہے اور اس انگریز کی چھاتی پر چڑھ کر اس کا گلا کاٹ دینا چاہتا ہے۔ انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں کس لیں اور آگے بڑھ کر صاحب کی ناک پر زوردار مکا لگانے کا ارادہ کیا لیکن وہ قدم آگے نہ بڑھا سکے۔ انہیں یاد آ گیا کہ جو بیرا ان سے پہلے کام کر رہا تھا، اس پر اس انگریز نے چوری کا الزام لگا دیا تھا اور وہ اب تک جیل خانے میں پڑا سڑ رہا ہے۔ اس پکڑنے والے پولیس کے سپاہی اور مقدمے کا فیصلہ کرنے والا مجسٹریٹ سب اس کے ہم وطن تھے لیکن کسی نے اس کی فریاد نہ سنی۔ صاحب نے اسے چور کہا تو سب نے اس الزام کو سچ مانا اور بے گناہ بیرے کو جیل خانے بھیج دیا۔

وہ لاحول پڑھ کر وہاں سے ٹل گئے اور اس بڑے کمرے میں آ گئے جہاں مہمانوں کو بٹھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ کوٹھی کے دوسرے نوکروں نے کرسیاں اور میزیں لگا دی تھیں، ہر چیز کو خوب رگڑ رگڑ کر چمکا دیا تھا اور اب بس اتنا کام باقی رہ گیا تھا کہ شراب، سوڈے کی بوتلیں اور پھل وغیرہ میزوں پر سجا دیے جائیں اور یہ کام سیّد نوازش علی کو کرنا تھا۔

کمرے میں آ کر انہوں نے ایک ایک چیز کو غور سے دیکھا۔ بخار سے ان کا بدن تپ رہا تھا اور غصے سے دماغ پکتی ہوئی ہانڈی

کی طرح کھول رہا تھا۔ ان کے جی میں آئی کہ ساری میزوں کو الٹا دیں، کرسیوں کو توڑ دیں اور اس بدتمیز انگریز اور میم کا گلا گھونٹ دیں لیکن وہ اپنے غصے میں آپ ہی جلنے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکے۔ چپ چاپ شراب کی بوتلیں اور دوسری چیزیں میزوں پر رکھنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد مہمان آنے شروع ہو گئے اور دیکھتے دیکھتے کمرا عورتوں اور مردوں سے کھچا کھچ بھر گیا۔ صاحب اور میم نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا، اس دعوت کے بارے میں کچھ باتیں کیں اور پھر مہمان کھانے پینے میں مصروف ہو گئے۔ کمرا شراب کی بدبو سے بھر گیا اور قہقہے چیخوں میں بدلتے چلے گئے۔ لگتا تھا نشے کی وجہ سے ان کی عقلوں پر پردہ پڑ گیا ہے۔ کسی کو نہ اپنے مرتبے کا ہوش تھا اور نہ اس بات کا اندازہ کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

سیّد صاحب دوسرے نوکروں کے ساتھ ایک طرف کھڑے تھے اور نفرت سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان سب کو یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہاں حاضر رہیں اور اگر کوئی مہمان کوئی چیز مانگے تو فوراً اس کی خدمت میں پیش کر دیں۔ بخار کی وجہ سے اب بھی ان کا بدن تپ رہا تھا اور سر کی تکلیف کچھ اور بڑھ گئی تھی لیکن اس سے بھی زیادہ تکلیف انہیں اس خیال سے ہو رہی تھی کہ قسمت نے انہیں کیسا ذلیل کام کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ وہ پکے سچے مسلمان اور پانچوں وقت کے نمازی تھے، لیکن انہیں حرام چیزیں صاحب کی میز پر لگانی پڑتی تھیں۔ وہ اور اس کی میم بات بات پر انہیں جھڑکیاں بھی دیتے تھے۔ کالا لوگ کالا لوگ کہہ کر ان کی توہین کرتے تھے لیکن وہ دل ہی دل میں کڑھنے کے سوا کچھ نہ کر سکتے تھے۔ کبھی جوش آتا تو پہلے بیرے کا واقعہ یاد آ جاتا جس نے کسی بات پر صاحب کو سخت لہجے میں جواب دے دیا تھا اور چوری کے بغیر چور بن گیا تھا۔

اس وقت وہ اسی قسم کے خیالات میں الجھے ہوئے تھے۔ کبھی اپنے خاندان کی بڑائی کا خیال آتا تھا، کبھی اس حالت کا جس میں ان کی کچھ حیثیت ہی نہ تھی۔ وہ سوچنے لگے آخر یہ کیوں ہوا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت مٹ گئی اور انگریز اس ملک کے مالک بن گئے؟

یہ سوال پہلے بھی کئی بار ان کے ذہن میں آیا تھا اور انہوں نے اس کے الگ الگ کئی جواب سنے تھے۔

جمعے کے دن مولوی صاحب نے کہا تھا۔ ''مسلمان ہندوستان کی حکومت سے اس لیے محروم ہو گئے کہ انہوں نے اسلام کے حکموں پر چلنا چھوڑ دیا تھا۔''

ایک لیڈر نے اپنی تقریر میں کہا تھا۔ ''مسلمانوں میں اتفاق نہ رہا تھا۔ وہ آپس میں لڑتے رہتے تھے اور ان کی اس کم زوری سے فائدہ اُٹھا کر انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔''

ایک اور لیڈر نے کہا تھا۔ ''مسلمان آرام پسند ہو گئے تھے۔ ان میں بہادری نہ رہی تھی۔ یوں ان سے ان کی حکومت چھن گئی۔''

سیّد صاحب انہی خیالوں میں بھٹک رہے تھے کہ ایک انگریز ہاتھ میں شراب کا گلاس لیے ان کے پاس آیا اور نشے میں بہکتے ہوئے بولا۔ ''ویل، مولوی! لو، تم بھی پیئو۔ کھولو منہ، ہم اپنا ہاتھ

سے پلانا مانگتا تم کو۔"

سیّد صاحب کو یوں لگا جیسے ان کی ناک کے سامنے گندگی سے بھرا ہوا ڈرم کھول دیا گیا ہو۔ شراب کی بدبو ان کے دماغ کو چڑھ گئی۔ وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولے۔ "پرے رہو صاحب، پرے رہو۔ میں یہ گندی چیز نہیں پیتا۔ میں مسلمان ہوں۔"

یہ سن کر دوسرے نوکر کھی کھی کر کے ہنسنے لگے۔ جن انگریز مردوں اور عورتوں نے یہ منظر دیکھا تھا، وہ قہقہے لگانے لگے۔ شرابی انگریز سیّد صاحب کی طرف اور بڑھ آیا اور شراب کا گلاس ان کے منہ سے لگانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "ویل، مولوی! ڈرو مت۔ ہم جانتا جب تک مسلمان شراب نئی پیئے گا، ہمارا حکومت مضبوط نئی ہوئے گا۔"

سیّد صاحب کو یوں لگا کہ ان کے اندر کا نوازش علی غصے میں بھر گیا ہے اور اس نے اپنی تلوار نیام سے نکال لی ہے۔ انہوں نے شراب کے گلاس پر زور سے ہاتھ مارا اور گرا گلاس ٹوٹنے کی آواز سے گونج اُٹھا۔ سب ان کی طرف دیکھنے لگے۔ شرابی انگریز نے گالی دی اور آستینیں چڑھانے لگا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ سیّد صاحب پر ہاتھ چلاتا، انہوں نے ایک زوردار مکا اس کی ناک پر رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر فرش پر گر گیا اور سیّد صاحب نے لاتوں اور مکوں سے اس کی مرمت کر دی۔

یہ سب کچھ اچانک ہوا۔ حکومت اور شراب کے نشے میں بے ہوش انگریز یہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ ایک بیرا ضلع ڈپٹی کمشنر پر ہاتھ اُٹھائے گا لیکن یہ سب کچھ ہو چکا تھا۔ پارٹی میں شامل انگریز کچھ دیر حیرت سے اپنے ساتھی کو پٹتے ہوئے دیکھتے رہے اور پھر سیّد صاحب پر پل پڑے۔ جس کے ہاتھ میں جو چیز آئی، اسی سے انہیں مارنا شروع کر دیا اور اس وقت تک مارتے رہے جب تک انہیں یہ یقین نہ ہو گیا کہ وہ مر گئے ہیں۔

نوکر سیّد صاحب کو چارپائی پر ڈال کر ان کے کوارٹر میں لائے تو وہ بے ہوش تھے لیکن اس بے ہوشی نے ان کی روح کو ایک اور ہی دُنیا میں پہنچا دیا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے بزرگوں کے محل کی اونچی ڈیوڑھی پر ایک مشعل روشن ہو گئی ہے، نوبت بج رہی ہے اور بڑھیا بڑھیا کپڑے پہنے ہوئے ہزاروں مرد، عورتیں اور بچے خوشی کے نعرے لگا رہے ہیں۔ ان کے زخمی چہرے پر عجب سکون تھا، جیسے مسکرانے کی کوشش کر رہے ہوں۔

نوکروں نے چارپائی کوارٹر کے صحن میں رکھی تو سیّد صاحب کی بیوی نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا۔ ایک نوکر بولا۔ "بھابی جی، آخر اس بدنصیب نے اپنے کیے کی سزا پا ہی لی۔ اب یہ تو بچے گا نہیں، تم اپنی جان بچاؤ۔ بچوں کو لے کر اسی وقت کوارٹر سے نکل جاؤ۔"

"لیکن انہیں ہوا کیا؟" بیوی نے سوال کیا۔

"ہونا کیا تھا۔ اس نے ڈپٹی کمشنر بہادر پر ہاتھ اُٹھایا اور تباہی کے غار میں گر گیا۔" نوکر نے یہ کہہ کر پورا واقعہ کہہ سنایا۔

نوکروں کا خیال تھا کہ سیّد صاحب کی بیوی رونے پیٹنے لگیں گی اور بچوں کو ساتھ لے کر بھاگنے کی تیاری کریں گی لیکن انگریز ڈپٹی کمشنر کے منہ پر مکا مارنے کی بات سن کر بیوی کے ہونٹوں پر یوں مسکراہٹ آ گئی جیسے کوئی بہت اچھی خبر سنی ہو۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اپنے شوہر کا زخمی ہاتھ چوما اور خوشی بھری آواز میں بولیں۔ "خدا کا شکر ہے! تم نے وہ کام کر دکھایا جس کا مجھے مدت سے انتظار تھا۔ ان شاء اللہ اب ہمارا وطن غلام نہ رہے گا۔ تم نے اپنے خون سے آزادی کی مشعل روشن کر دی ہے۔ اب یہ مشعل کبھی نہ بجھے گی۔ کبھی نہ بجھے گی!!"

☆☆☆

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10/اگست 2016ء ہے۔

جولائی 2016ء کے ''بلاعنوان کارٹون'' کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی **500** روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- اُدھر ہنستے ہو تم اِدھر روتے ہیں ہم، زندگی کے ہیں یہ رنگ نرالے (نجم السحر، ملک وال)
- کیوں گھور رہے ہو، کیا نظر لگانے کا ارادہ ہے؟ (ایمن فاطمہ، ملتان)
- اپنی بیٹ پوجا، جہنم میں جائے دوجا (ثمین مقصود، لاہور)
- واہ رے پپّو بھائی! کیا ٹیبل ہے بنائی (خنسہ حسینی، کلورکوٹ)
- ایک پنتھ دو کاج (عبدالمتین، لاہور)

ہونہار مصور

بارش کا ایک دن

تصاویر صرف الٹی رخ میں ہی بنائیں۔

محمد زبیر جمشید، جہانیاں (پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

راحم عمران، بہاول پور (دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

قرینہ فاطمہ فاروقی، رحیم یار خان (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

مومنہ عامر حجازی، لاہور (چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

مرزا احسن، فیصل آباد (پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بذریعہ قرعہ اندازی: محمد بن حسن، لاہور۔ سراج اقبال خوجہ، ڈیرہ غازی خان۔ سید تحریم مختار، لاہور۔ مرزا محمد احمد، فیصل آباد۔ خنسہ حسنی، [illegible]۔ آمنہ عاصم، راولپنڈی۔ سید [illegible]، لاہور۔ بشریٰ حسنی، [illegible]۔ سارہ نعمان، لاہور۔ اقرا [illegible]، واہ کینٹ۔ لائبہ بشیر، تلہ گنگ۔ نورین اشفاق، رحیم یار خان۔ عبدالغفور حیدری، کراچی۔ محمد زبیر ارشد، لاہور۔ عائشہ نذیر، کراچی۔ بلال عابد بٹ، [illegible]۔ رانا عبداللہ، ملتان۔ محمد الحسن، خانیوال۔ بشریٰ بتول، رسال پور۔ نور الامین، اسلام آباد۔ اعیان جنید، حیدر آباد۔ فردوس خالد، اٹک۔ محمد [illegible]۔ عثمان حیدر، پشاور۔ مریم نواز، فیصل آباد۔ ندیم بیگ، نوشہرہ۔ احسن فاروق، راولپنڈی۔ نفضت بتول، لاہور کینٹ۔ نوشین مسعود، ملتان۔ محمد یٰسین قمر، خانیوال۔ اختر بھٹی، جہلم۔ محمد اسلم، راولپنڈی۔ عامر نبیل، لاہور۔ عمران فاروق، اوکاڑہ۔ نیرہ بشیر، قصور۔ ریاض حسین، واہ کینٹ۔ ام کلثوم، خانیوال۔ بینش آفاق، کراچی۔ وقار صادق، راولپنڈی۔ جاوید اقبال، گوجرانوالہ۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

اگست کا موضوع: ہم پاکستان — آخری تاریخ 8 اگست

ستمبر کا موضوع: گائے کی قربانی — آخری تاریخ 8 ستمبر